U G U R - 104 (N)

چوتھا پرچہ: قصیدہ مرثیہ اور مثنوی

بلاک ۱۔قصیدہ

اکائی ۱: اردو قصیدے کے لغوی اور اصطلاحی معنی اور اس کے اقسام

اکائی ۲: قصیدے کی اجزائے ترکیبی

اکائی ۳: اردو قصیدہ نگاری کا آغاز وارتقاء اور اس کے زوال کے اسباب

اکائی ۴: سودا کی مختصر سوانح فن کا تجزیہ اور قصیدہ شہر آشوب کا تنقیدی تجزیہ

بلاک ۲۔مرثیہ

اکائی ۷: میر انیس کی مختصر سوانح اور فن پر تبصرہ (نمکِ خوانِ تکلم ہے فصاحت میری کا تنقیدی جائزہ)

اکائی ۸: مرزا دبیر کی مختصر سوانح اور فن پر تبصرہ (دستِ خدا کا قوتِ بازو حسین ہے کا تنقیدی تجزیہ)

بلاک ۱: قصیدہ

اکائی (۱): قصیدہ کی تفہیم وتعریف اور اقسام

1.1 اکائی کے اغراض ومقاصد

اس اکائی میں اردو قصیدہ نگاری سے متعلق ضروری معلومات فراہم کی جائیں گی، جس میں قصیدے کی تعریف، وجہ تسمیہ، ماخذ، ہیئتی اور فنی اعتبار سے اس کے اوصاف وغیرہ لوازمات سے مختصراً بحث ہوگی نیز موضوعاتِ قصائد اور اقسامِ قصائد سے متعلق ضروری معلومات کے علاوہ اردو شاعری کی اس قدیم اور شاندار صنف سخن کے اجزائے ترکیبی پر بھی روشنی ڈالی جائے گی اور بعض اجزاء کو مثالوں کی مدد سے سمجھایا بھی جائے گا۔

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ:

☆ صنف قصیدہ کی تعریف، ابتدا، ماخذ وغیرہ کی وضاحت کر سکیں۔

☆ قصیدے کے مخصوص موضوع اور اس کے اقسام کو بہ آسانی سمجھ سکیں۔

☆ اردو قصیدہ گوئی کے اجزائے ترکیبی نیز ارتقائی منازل پر روشنی ڈال سکیں گے اور

☆ قصیدے کے زوال کے اہم پہلوؤں کا بہ نظرِ غائر جائزہ لے سکیں گے۔

1.2 تمہید

قصیدہ اردو شاعری کی ایک اہم اور قدیم صنف ہے، جس کی بنیاد عربی اور فارسی کے شعری سرمایہ پر قائم ہے۔ اردو میں اس کا ماضی بہت روشن اور تابناک رہا ہے۔ اٹھارویں اور نصف انیسویں صدی عیسوی میں غزل اور دوسری اصناف سخن کے دوش بہ دوش اردو قصیدہ نگاری کو بڑا عروج حاصل ہوا۔ اگرچہ فی زمانہ وقت اور تبدیلیٔ حالت کے باعث اس کی مقبولیت اور فنّی حیثیت میں کمی واقع ہوئی ہے، تاہم بعض خصوصیات کی بنا پر اردو شاعری کی اس نہایت پرشکوہ اور شاندار صنفِ شاعری سے واقفیت نیز اس کے زوال کے اسباب وعلل پر بھی غور وفکر کرنا ازبس ضروری ہے۔

اردو شاعری کی نمایاں اصناف میں قصیدہ ایک اہم صنف سخن ہے جس میں کسی کی مدح یعنی تعریف یا پھر اس کی ہجو یعنی برائی کی جاتی ہے۔ علمائے ادب کا عام خیال ہے کہ قصیدہ دراصل لفظ ''قصد'' سے نکلا ہے کیونکہ قصیدے میں شاعر ارادہ کر کے اپنے خیالات وجذبات کا اظہار کسی کی مدح یا ہجو کی صورت میں کرتا ہے۔

قصیدہ عربی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی ہیں مغز غلیظ یعنی گاڑھا مغز۔ قصیدے میں چونکہ عام طور پر مضامین نادر بلند اور پُر شکوہ ہوتے ہیں، اس لئے تمام شعری اصناف میں اس کا مرتبہ ومقام انسانی جسم میں مغزِ سر کی طرح اہمیت کا حامل ہے۔

ہیئتی نقطۂ نظر سے غور کیا جائے تو قصیدے کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ غزل جیسی مقبول صنف سخن اس کے بطن سے پیدا ہوئی۔ لہٰذا قصیدہ کی ہیئت بڑی حد تک غزل کی سی ہے یعنی غزل کی طرح قصیدہ کا پہلا شعر بھی مطلع کہلاتا ہے اور اس

کے دونوں مصرعوں میں عموماً قافیہ وردیف ہوتا ہے۔لیکن بعض قصیدے بغیر ردیف کے ہوتے ہیں۔باقی اشعار کے دوسرے مصرعوں میں قافیہ وردیف یا صرف قافیہ ہوتا ہے۔غزل ہی کی طرح قصیدہ میں مقطع بھی ہوتا ہے لیکن قصیدے میں کچھ چیزیں غزل سے مختلف ہوتی ہیں۔مثال کے طور پر ایک قصیدے میں کئی مطلع ہو سکتے ہیں اور مقطع ضروری نہیں کہ قصیدہ کا آخری شعر ہو۔علاوہ ازیں قصیدے میں غزل کے برعکس لیکن نظم کی طرح، خیالات ومضامین مربوط ومسلسل ہوتے ہیں۔ساتھ ہی موضوع کے لحاظ سے ہر قصیدے کا کوئی نہ کوئی عنوان بھی ہوتا ہے۔مثلاً ''در منقبت حضرت علیؑ'' اور'' قصیدہ در مدح نواب آصف الدولہ بہادر رستم جنگ'' از مرزا محمد رفیع سوداؔ۔عنوان کے باوجود کبھی کبھی یہ ہوتا ہے کہ قصیدہ کو قافیہ کے آخری حرف کی مناسبت سے مخصوص نام دے دیا جاتا ہے۔مثلاً قصیدہ لامیہ، کافیہ وغیرہ۔قصیدہ کی تعریف وتفہیم کے سلسلے میں یہ بات ذہن نشین رکھنے کی ہے کہ قصیدے کا تصور بالعموم مدح وذم کے مضامین سے ہے تاہم اردو قصائد میں فارسی کی طرح بہ اعتبار موضوع بڑا تنوّع ہے اور ایسے قصیدوں کی قطعی کمی نہیں ہے جن میں اخلاق وحکمت، پند ونصائح، کیفیت بہار، گردش زمانہ، روساً اور بزرگانِ دین کے اوصافِ حمیدہ وغیرہ کو موضوعِ سخن بنایا گیا ہے

اقسامِ قصیدہ

مختلف خصائص اور نوعیّتوں کے لحاظ سے قصیدے کے مختلف اقسام ہیں۔ظاہری شکل کے پیش نظر عام طور پر قصیدے کی دو قسمیں ہیں۔تمہیدیہ اور خطابیہ۔

تمہیدیہ: وہ قصیدہ ہے جس میں ممدوح کی سیرت کے اوصاف اس کے ساز وسامان اور دیگر متعلقات کی تعریف وتوصیف سے پہلے بطور تمہید، تشبیب اور گریز بعدہٗ مدح ودعا خاص ترکیبی عناصر کا درجہ رکھتے ہیں۔اس طرح تمہیدیہ قصیدہ وہ ہے جس میں اصل مدّعا سے پہلے تمہید باندھی جائے اور پھر اس کے بعد آخر میں اظہار مدّعا کیا جائے۔اردو میں زیادہ تر قصائد اسی قسم کے ہیں۔

خطابیہ: اس نوع کے قصیدے میں تشبیب وگریز کے اجزاء نہیں ہوتے بلکہ براہ راست ممدوح کی تعریف سے قصیدہ شروع کر دیا جاتا ہے۔اس طرح خطابیہ قصیدہ وہ ہے جس میں شاعر تمہید باندھے بغیر مدّعا بیان کر دے۔مطلب یہ کہ اگر قصیدہ مدحیہ ہے تو شاعر ممدوح کو خطاب کرے اور اس کے اوصاف کو بلا تامّل بیان کرنا شروع کر دے۔اسی طرح قصیدہ اگر ہجو یہ ہے تو براہ راست اس کی مذمت کرنے لگے اور اصل مدّعا اگر وعظ ونصیحت ہے تو بغیر کسی تمہید کے اس کا آغاز کر دیا جاتا ہے۔مثلاً عالم گیر ثانی کی مدح میں سوداؔ کا مندرجہ ذیل خطابیہ قصیدہ بغیر کسی رسمی تمہید یا پر شکوہ تشبیب کے یوں شروع ہوتا ہے:

ہے اشتہار تجھ سے مرا، اے فلک جناب — رخشندگیٔ ذرّہ ہے از فیضِ آفتاب
یک تخم ہوں مَیں خاک نشینِ زمینِ شور — نشو ونما دے مجھ کو کرم کا ترے سَحاب
ہے یہ جہاں میں وہ در دولت سَرا کہ یاں — نا کام بخت، آن کے ہوتا ہے کام یاب

اپنی معلومات کی جانچ کیجئے :

۱۔ لفظ ''قصیدہ'' کس لفظ سے مشتق ہے :

(الف) استقصار (ب) مقصد

(ج) قصد (د) قصور

۲۔ قصیدے کا اصل تعلق ہے:

(الف) مدح سے (ب) مدح یا ہجو سے

(ج) تعقید سے (د) دعا و مدعا سے

۳۔ غزل اور قصیدے میں ہیئتی اعتبار سے کیا چیز مشترک ہے؟

(الف) مقطع (ب) مطلع ثانی

(ج) مطلع (د) تشبیب

۴۔ بہ لحاظ اظہار و موضوع قصیدہ، اردو شاعری کی کون سی صنف سے زیادہ قریب ہے؟

(الف) رباعی (ب) غزل

(ج) مرثیہ (د) نظم

معروضی سوالوں کے جواب: (۱) ج (۲) ب (۳) ج (۴) د

اکائی (۲)   اردو قصیدے کی خصوصیات اور اجزائے ترکیبی :

بہ لحاظ مضمون اردو قصیدے کی بنیاد عموماً مدح یا پھر ذم پر قائم ہے۔ شوکت الفاظ کے علاوہ قصیدے کی خصوصیت و اہمیت نادر و بلند اور پر شکوہ مضامین کی وجہ سے ہے۔ مدح اور ذم کے ساتھ اردو قصائد میں کیفیتِ بہار، گردشِ زمانہ، پند و نصائح، اخلاق و حکمت، ملکی اور قومی حالات و مسائل اور زندگی میں پیش آنے والے روزمرہ کے واقعات کو بھی جگہ دی جاتی رہی ہے۔

ہیئتی نقطۂ نظر سے قصیدے اور غزل میں زیادہ فرق نہیں۔ البتہ نظم کی طرح قصیدہ کا بھی ایک عنوان ہوتا ہے اور خیالات و مضامین آپس میں مربوط اور مسلسل ہوتے ہیں۔ اس طرح اردو قصائد کا تصوّر مدح اور ذم کے مضامین سے وابستہ ہے تاہم اس صنفِ شاعری میں دیگر موضوعات کا قحط وفقدان بھی نہیں ہے۔ چنانچہ اوپر بیان کئے گئے موضوعات کے علاوہ رؤسا اور بزرگانِ دین کے اوصافِ حمیدہ کے بیانات بھی اردو قصائد کی اہم خصوصیات میں شامل ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بادشاہوں، رؤسا اور امراء کے درباروں نے ہمیشہ اردو شاعری کی اس ممتاز اور اہم کلاسیکی صنف کی قدر و قیمت کی جانب توجہ کی ہے اور اس کے فروغ و منزلت کی راہ کو ہموار کرنے میں دلچسپی اور مدد سے کام لیا ہے۔ شاندار، توانا اور پُر شکوہ الفاظ کے علاوہ تشبیہات و استعارات کی جدّت، تراکیب کا نیا پن اور محاوروں کے برمحل اور بلیغ استعمال نے اردو قصیدہ نگاری کو ہمیشہ قدر و منزلت عطا کی۔ تخیّل کی بلندی اور غیر معمولی مبالغہ آرائی بھی قصیدے کے اختصاصی پہلو اور امتیازات ہیں جس کی وجہ سے اردو شاعری کی یہ صنف دل سے زیادہ دماغ کی شاعری کہی جاتی ہے۔

قصیدے کے اجزائے ترکیبی

ا۔ تشبیب :

قصیدے میں اجزائے ترکیبی کے لحاظ سے پانچ عناصر ہوتے ہیں۔ ابتدائی حصہ جو تمہید کے طور پر بیان کیا جاتا ہے تشبیب یا نسیب کہلاتا ہے جس میں عموماً بہاریہ مضمون، حسن و شباب، رندی و سرمستی زمانے کی شکایت، دنیا کی بے ثباتی، علوم و فنون کی بے قدری، خودستائی، تصوف و اخلاق وغیرہ موضوعات کو بالعموم موضوعِ سخن بنانے کی روایت رہی ہے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو قصیدہ کی تعمیر و تشکیل میں تشبیب کا نہایت اہم اور مفید کردار رہا ہے کہ اس سے قصیدہ کی معنوی اور موضوعی دنیا کافی وسیع اور متنوّع ہوئی ہے۔

قصیدے میں شاعر کا اصل مدّعا ممدوح کی تعریف کر کے اسے خوش کرنا اور اعتماد میں لینا ہوتا ہے اور جس کے عوض اسے ممدوح سے صلہ و انعام ملنے کی توقع ہوتی ہیں۔ اس لئے ضروری ہے کہ ممدوح کی توجہ مبذول کرانے اور اس کے دل میں اپنے لئے ایک نرم گوشہ بنانے کے لئے قصیدہ گو ہمیشہ ایک خوشگوار فضا اور ماحول تیار کرنے کی کوشش کرتا ہے جو مدح کے مضامین نظم کرنے سے قبل تمہید کے طور پر قصیدے کی زینت کا حصہ ہوتے ہیں اور جسے سن کر ممدوح پوری طرح شاعر کی جانب متوجہ ہو جاتا ہے۔

تشبیب میں پہلے شعر کی بڑی اہمیت ہوتی ہے جو غزل کی مانند، قصیدے کا مطلع کہلاتا ہے اور جس میں اکثر ردیف و قافیہ یا پھر صرف قافیہ کا التزام ہوتا ہے۔ قصیدے کے مطلع کے متعلق عام خیال ہے کہ اُسے پر شکوہ اور جدّتِ خیال کا حامل ہونا چاہئے تاکہ اسے سنتے ہی ممدوح ہمہ تن متوجہ ہو جائے اور بعد میں آنے والے اشعار اُس پر خوشگوار اثرات چھوڑ سکیں۔ تشبیب کی ایک اہم خوبی یہ بھی

ہے کہ اس میں بیان کردہ مضامین ممدوح کے منصب کے نہ صرف مطابق ہوتے ہیں بلکہ بعد میں آنے والے مدحیہ اشعار سے معنوی ربط ومناسبت بھی رکھتے ہیں۔ایک اور اہم بات تشبیب سے متعلق یہ بھی ذہن نشیں رکھنے کی ہے کہ اس میں اشعار کی تعداد عموماً مدح سے زیادہ ہوتی ہے مگر یہ کوئی اصول یا کلیہ نہیں۔خاص اور قابل غور بات اس قدر ہے کہ تشبیب کے پرشکوہ اشعار قصیدے کے معنی ولطف کو دو بالا کر دیتے ہیں۔غالبؔ کے ایک قصیدے کی تشبیب کے چند اشعار بطور مثال ملاحظہ کیجئے ؎

صبح دم دروازۂ خاور کھُلا　　مہرِ عالم تاب کا منظر کھُلا
خسروِ انجم کے آیا صرف میں　　شب کو تھا گنجینۂ گوہر کھُلا
وہ بھی تھی اک سیمیا کی سی نمود　　صبح کو رازِ مہ و اختر کھُلا
ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ　　دیتے ہیں دھوکا یہ بازی گر کھُلا
سطحِ گردوں پر پڑا تھا رات کو　　موتیوں کا ہر طرف زیور کھُلا
صبح آیا جانبِ مشرق نظر　　اک نگارِ آتشیں رُخ سر کھُلا

۲۔　گریز :

یہ قصیدے میں تشبیب اور مدح کے درمیان ایک منطقی رابطے کی کڑی ہے اور تشبیب سے گریز کر کے شاعر مدح کی طرف قدم بڑھاتا ہے۔مگر اس احتیاط اور فن کاری کے ساتھ کہ یہ محسوس ہو جیسے بات سے بات نکل آئی ہے۔اصطلاح میں گریز دوسرکش بیلوں کو ایک جوئے میں جوتنے کے معنی میں لیا گیا ہے جو ایک بڑی مہارت کی بات ہے۔گریز، قصیدے کے دیگر اجزائے ترکیبی کے مقابلے میں بیحد مختصر ہوتا ہے اور پورے قصیدے کو معنوی کڑیوں میں مربوط رکھنے کے لئے اہم اور منطقی ذہن کا مقتضی ہوتا ہے۔

بہادر شاہ ظفر کی مدح میں غالبؔ نے ایک مختصر قصیدہ تحریر کیا ہے جس کی تشبیب نہایت دلکش ہے اور جس میں وہ پہلی تاریخ کے چاند سے پوچھتے ہیں کہ تو کس کو جھک کر سلام کر رہا ہے؟ جواب نہ ملنے پر شاعر بڑی فنکاری کا مظاہرہ کرتے ہوئے گریز کے اشعار کی طرف آتا ہے اور کہتا ہے کہ وہ جلیل القدر شخصیت شہنشاہ بہادر شاہ ظفر کی ہے ؎

تو نہیں جانتا تو مجھ سے سُن　　نام شاہنشہِ بلند مقام
قبلۂ چشم و دل بہادر شاہ　　مظہرِ ذوالجلال و الاکرام

۳۔　مدح :

گریز کے بعد قصیدے کا تیسرا اہم جزو مدح ہے۔اس میں ممدوح کی ذات کے جملہ اوصاف کا بیان ہوتا ہے۔جس میں شاعرانہ مبالغہ آرائی سے کام لے کر شاعر قصیدے کی عالی شان عمارت قائم کرتا ہے اور اسی حصے میں شاعر کی قوّتِ اظہار اور تخیّل آفرینی کے جوہر بھرپور انداز میں کھُلتے ہیں نیز ممدوح کے جملہ متعلقات جیسے فوجی ساز وسامان، ہاتھی، گھوڑے، تیر تلوار اور دیگر جنگ کے آلات کو بھی موضوعِ سخن بنایا جاتا ہے اور ان سب چیزوں کی تعریف وتوصیف میں وہی زورِ بیان صَرف کیا جاتا ہے جو خود ممدوح کے ذاتی صفات کے اظہار میں ہوتا ہے۔واضح رہے کہ مدح میں حفظ مراتب کا خیال از حد ضروری ہے نیز تعریف ایسی ہو جو ممدوح کے شایان

شان ہو۔ بہادر شاہ ظفر کی مدح میں مرقوم غالبؔ کے مشہور قصیدے کے یہ اشعار بطور نمونۂ کلام ملاحظہ ہوں جس میں ممدوح کے ذاتی اوصاف اور متعلقات کی نہایت پُر جوش داد و تحسین کی گئی ہے ۔

قبلۂ چشم و دل بہادر شاہ　　مظہرِ ذوالجلال و الاکرام
شہسوارِ طریقۂ انصاف　　نو بہارِ حدیقۂ اسلام
جس کا ہر فعل صورت اعجاز　　جس کا ہر قول معنیٔ الہام
بزم میں میزبانِ قیصر و جَم　　رزم میں اوستادِ رستم و سام

۴۔ عرض مطلب یا مدّعا :

یہ قصیدے کا چوتھا جزو ہے، جس میں قصیدہ گو، مدح گوئی کے بعد اپنے ذاتی حالات اور اغراض و مطالب کا اظہار کرتا ہے۔ مدح و تعریف کی داد طلب کرنے کے علاوہ ممدوح سے مالی منفعت اور صلہ و اکرام کا حصول بھی شاعر کا خاص مقصد ہوتا ہے مگر یہ ضروری نہیں کہ ہر قصیدے میں شاعر اپنا مدعا بیان کرے۔ اس طرح عرضِ مطلب قصیدے کا لازمی جزو نہیں ہے۔ قصیدہ ''در مدح بہادر شاہ'' میں غالب اپنا عرض مدّعا بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں ۔

میرا اپنا جدا معاملہ ہے　　اور کے لین دین سے کیا کام؟
ہے مجھے آرزوئے بخششِ خاص　　گر تجھے ہے اُمیدِ رحمتِ عام
جو کہ بخشے گا تجھ کو فَرّ فُروغ　　کیا نہ دے گا مجھے مئے گلفام؟

اسی طرح ایک دوسری جگہ مرزا غالبؔ اپنی مالی مشکلات بیان کرنے کے بعد کہتے ہیں ۔

میری تنخواہ کیجئے ماہ بہ ماہ　　تا نہ ہو مجھ کو زندگی دُشوار

۵۔ دعا :

قصیدے کا آخری جزو دعا ہے جس میں قصیدہ گو اپنے ممدوح کو درازیٔ عمر، بلندیٔ اقبال، شان و شوکت اور زر و مال میں افزونی و ترقی وغیرہ کی دعا دے کر قصیدہ ختم کر دیتا ہے۔ اس لحاظ سے دعائیہ اشعار مدحیہ قصیدے کے لئے ایک طرح سے ضروری اور لازمی ہو جاتے ہیں جس میں بقول شمیم احمد

> ''ممدوح کے علاوہ اس کے اقربا اور دوستوں کو بھی دعا دی جاتی ہے۔ بعض قصیدوں میں یہ بھی ہوتا ہے کہ دوستوں کو دعا دینے کے ساتھ ممدوح کے دشمنوں کو بد دعا دی جاتی ہے۔ اس طرح قصیدہ اوّل تا آخر ایک منظّم اور سوچے سمجھے پلان پر تیار کردہ شعری تخلیق ہے۔ اس کے لئے اس کے مضامین اور اظہار میں زیبائش و آرائش کے سارے لوازمات بہ اہتمام اور پوری شعوری کوشش سے داخل کئے جاتے ہیں۔ ان وجوہ سے زبان و بیان کے معاملے میں قصیدہ دیگر اصناف سخن کے بمقابلہ زیادہ مہتم بالشان صنف سخن ہے۔''

بحوالہ ''اصناف سخن اور شعری ہیئتیں''، صفحہ ۵۴ پہلی اشاعت ۱۹۸۱، انڈیا بک امپوریم، بھوپال

اپنی معلومات کی جانچ کیجئے

۱۔ قصیدہ سے متعلق کون سا خیال زیادہ درست ہے؟

(الف) قصیدہ جذبہ و احساس کی شاعری ہے۔ (ب) سماجی احساس کی شاعری ہے۔

(ج) دل سے زیادہ دماغ کی شاعری ہے۔ (د) ان میں سے کوئی بھی خیال درست نہیں۔

۲۔ قصیدوں میں گریز کے اشعار کب لائے جاتے ہیں؟

(الف) مدح اور مدعا کے درمیان (ب) قصیدوں کی ابتدا میں

(ج) تشبیب کے بعد اور مدح سے پہلے (د) مدعا کے بعد اور اختتامیہ سے پہلے

۳۔ حفظِ مراتب کا خیال قصیدے کے کس اجزائے ترکیبی سے متعلق ہے؟

(الف) گریز (ب) تشبیب

(ج) مدح (د) عرضِ مدعا

۴۔ قصیدے کا آخری جزو ہے:

(الف) دعا (ب) عرضِ مطلب

(ج) گریز (د) مدح

معروضی سوالوں کے جواب: (۱) ج (۲) ج (۳) ج (۴) الف

اکائی (۳) اردو قصیدے کا آغاز وارتقاء

اردو میں قصیدہ نگاری کی ابتدا دکن سے ہوئی۔ اس سلسلے میں سلطان محمد قلی قطب شاہ (۱۵۲۵ء۔۱۶۱۲ء) کے علاوہ ولؔی اور نصرتؔی کے نام قابل ذکر ہیں۔ قدیم دکنی اور نامانوس الفاظ کی کثرت کے سبب ان شعراء کے قصائد کی زبان کو دکنی اردو کہا گیا ہے۔ ولؔی جو خود صوفیانہ مزاج کے مالک تھے، ان سے بادشاہوں اور امیروں کی قصیدہ خوانی کی زیادہ توقع نہیں کی جاسکتی۔ تاہم ان کے کلیات میں چند قصائد بھی شامل ہیں۔ حضرت شاہ وجیہہ الدین کی مدح میں لکھا ہوا ایک قصیدہ اگر چہ قابلِ ذکر ہے تاہم علمائے ادب کی رائے ہے کہ وہ فن قصیدہ نگاری کی کسوٹی پر پورا نہیں اترتا ہے۔

اردو قصیدہ نگاری کا زرّیں عہد مرزا محمد رفیع سوداؔ (۱۷۱۲ء۔تا۱۷۸۱ء) سے شروع ہوتا ہے۔ اگر چہ سوداؔ اردو شاعری کی تمام اصناف پر قادر تھے مگر قصیدہ اور ہجو سے ان کی طبیعت کو خاص مناسبت تھی۔ کہا جاتا ہے کہ سوداؔ بڑے زود رنج بھی تھے اور ذرا ذرا سی بات پر لوگوں سے خفا ہو جایا کرتے تھے۔ اسی لئے ان کے متعلق مشہور ہے کہ ذرا کسی سے بگڑی اور انھوں نے اُس کی ہجو کہی۔ وہ انتہائی ذہین اور نابغۂ روزگار تھے۔ سوداؔ نے جو قصائد لکھے ہیں اس سے ان کی ذہنی طبّاعی، تخلیقی صلاحیت اور استادی کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

انھوں نے فارسی شاعروں کے کامیاب قصائد کی روشنی میں قصیدے لکھ کر اردو قصیدہ نگاری کو معراجِ کمال تک پہنچادیا۔ سوداؔ کے قصائد میں بڑا زور، ندرتِ بیان اور شگفتگی ہوتی ہے۔ ساتھ ہی بلند آہنگ الفاظ کا استعمال، پُرشکوہ لب ولہجہ اور مضمون آفرینی یعنی بات میں بات پیدا کرنا سودا کے اسلوب کی اہم خصوصیات ہیں۔ مثال کے طور پر ان کے ایک قصیدے سے تشبیب کے چند اشعار ملاحظہ ہوں جس میں نئے نئے خیالات کے علاوہ مبالغے کا زور ایسا ہے کہ جس پر صاف آمد کا گمان ہوتا ہے۔

اٹھ گیا بہمن ودَے کا چمنستان سے عمل — تیغِ اُردی نے کیا ملکِ خزاں مُستاصل
قوتِ نامیہ لیتی ہے نَباتات کا عرض — ڈال سے پات تلک، پھول سے لیکر تا پھل
واسطے خلعتِ نَوروز کے ہر باغ کے بیچ — آب جو قطع لگی کرنے روش پر مخمل
بخشتی ہے گل نورُستہ کی رنگ آمیزی — پوششِ چھینٹ قلمکار بہ ہر دشت و جبل
عکسِ گلبن وہ زمیں پر ہے کہ جس کے آگے — کار نقاشِ مانؔی ہے دُوَم وہ اوّل

سوداؔ کے بعد ان کے معاصرین میں میر تقی میرؔ نے بھی چند قصیدے لکھے ہیں مگر ان کی طبیعت اس صنف سخن کے لئے موزوں نہ تھی۔ غزل کی طرح افسردگی اور بیچارگی کا رنگ ان کے قصائد پر بھی غالب ہے۔ درد وغم کا اظہار، جو میرؔ کی غزلوں کی اہم خصوصیت ہے، وہی مزاج اور لب ولہجہ اُن کے قصیدوں کا بھی ہے۔ میرؔ کے ایک مشہور قصیدے کا مطلع ہے۔

جو پہنچے قیامت تو آہ فغاں — مرے ہاتھ میں دامن آسماں

میرؔ کے بعد انشؔا اور مصحفؔی نے بھی میرؔ سے بہتر قصیدے لکھے تاہم ان شاعروں کو کبھی قبول عام اور شہرت نصیب نہ ہوئی۔ انشؔا کی غیر سنجیدگی اور مصحفؔی میں زورِ طبیعت کی کمی نے انھیں اِس صنفِ شاعری میں آگے نہ بڑھنے دیا۔ اس کے بعد دہلی کے شاعروں میں ذوقؔ، غالبؔ اور مومن خاں مومنؔ نے قصیدہ نگاری کی طرف توجہ کی مگر ذوقؔ کو چھوڑ کر دونوں ہی باکمالوں کی شہرت غزل گو کی حیثیت

سے ہوئی۔ پھر بھی، ان دونوں شاعروں نے قصیدہ گوئی کے میدان میں کافی شہرت اور کامیابی حاصل کی۔ سوداؔ کے مقابلے میں اگر چہ ذوقؔ کے یہاں فطری سادگی کا فقدان ہے تاہم ذوقؔ نے کلام کی چستی اور بندش کی دلآویزی سے بڑی حد تک قصیدے میں بیساختگی پیدا کرنے میں کامیابی حاصل کی ہے۔ دراصل قصیدے کی کامیابی اس کے اجزائے ترکیبی میں ایک خوشگوار ربط اور مختصر گریز کہنے کی مہارت پر قائم ہے۔ ذوقؔ کے قصائد اس خصوصیت کے حامل ہیں۔ قصیدہ ''در مدح بہادر شاہ'' اسکی عمدہ مثال ہے۔ صرف دو شعر بطور نمونۂ کلام ملاحظہ کر لئے جائیں۔

زہے نشاط! اگر کیجئے اسے تحریر — عیاں ہو خامہ سے تحریرِ نغمہ، جائے صَریر
زباں سے ذکر اگر چھیڑئے تو پیدا ہو — نفس کے تار سے آوازِ خوش تر از بم و زیر

اس قصیدے میں شیخ محمد ابراہیم ذوقؔ کی جولانئ طبع اور زور بیان کا اندازہ بہ آسانی لگایا جا سکتا ہے جو ان کی قوت تخیل، مضمون آفرینی اور کمال فن کی عمدہ مثال ہے۔

اردو قصیدے کے ارتقائی سفر میں ذوقؔ کے معاصرین میں دوسرا اہم نام مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ کا ہے۔ قدرت نے انھیں بڑا ذہین اور اعلیٰ دماغ بنایا تھا۔ غالبؔ نے چند ایک ہی قصیدے لکھے مگر ان کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے مدحیہ قصائد میں بڑا زور صَرف کیا ہے اور جوشِ بیان و زورِ بیان کا بے مثل نمونہ پیش کر دیا ہے۔ جدّت اور فکر کے لحاظ سے غالبؔ نے اردو قصیدہ نگاری کو ایک نیا مزاج بخشا خاص طور پر تشبیب کے بیان میں ان کی پیشکش نہایت جاندار ہوتی ہے۔ چند اشعار دیکھئے۔

ہاں مہِ نَو! سنیں ہم اُس کا نام — جس کو تو، جھک کے کر رہا ہے سلام
دو دن آیا ہے تو نظر دمِ صبح — یہی انداز اور یہی اَندام
بارے دو دن کہاں رہا غائب — بندہ عاجز ہے گردشِ ایّام
اڑ کے جاتا کہاں کہ تاروں کا — آسماں نے بچھا رکھا تھا دام

شاہ ظفرؔ کی مدح میں عید الفطر کے موقع پر لکھا گیا غالبؔ کا مذکورہ قصیدہ نہایت بلند پایہ ہے۔ تشبیہات اور استعارات سے قصیدے میں جو حسن پیدا ہوا ہے، وہ محتاجِ بیان نہیں ہے۔

غالبؔ کے معاصرین میں مومن خاں مومنؔ کے قصائد میں نازک خیالی کا بڑا دخل ہے، تاہم مرزا غالبؔ جیسی جامعیت اور آفاقیت نہیں ہے۔ مومنؔ نے بادشاہوں کی مدح سرائی سے حتیٰ الامکان احتراز کیا ہے۔ دو ایک قصیدے کو چھوڑ کر ان کی یہاں مذہبی قصائد اور خلفائے راشدین کی مدح میں ہی قصیدے دیکھنے کو ملتے ہیں جن میں جذباتِ قلبی اور احساساتِ ذاتی کے علاوہ شعری محاسن اور فنّی لوازم بہ حدِّ کمال دیکھے جا سکتے ہیں۔

انیسویں صدی کے ربعِ آخر تک اردو قصیدہ نگاری کی ارتقائی منزل اور رفتار میں کمی واقع ہونے لگی۔ بادشاہ اور امراء کی تعریف کی جگہ اردو قصیدہ نگاروں نے بزرگان دین کی شان میں قصیدے لکھنے شروع کر دئے کہ ۱۸۵۷ء کے بعد نہ بادشاہت رہی نہ امیر و امراء کا رعب و دَبدبہ اور مالی حیثیت کہ جس کی وجہ سے اردو قصیدہ گویوں کی معاشی حیثیت برقرار و بہتر رہتی اور انھیں اک گونہ آرام

واطمینان میسر آتا۔ چنانچہ شیخ ابراہیم ذوقؔ کے بعد اردو قصیدہ گویوں میں جو نام سب سے زیادہ تابناک اور روشن نظر آتا ہے وہ محسنؔ کاکوروی کا ہے ''مدیح خیرالمرسلین'' کے عنوان سے لکھا ہوان کا قصیدہ ۔

سمتِ کاشی سے چلا جانبِ متھرا بادل برق کے کاندھے پہ لاتی ہے صبا گنگا جل

بہت زیادہ مشہور ہوا اور جس نے اردو قصیدہ نگاری کی تاریخ میں محسنؔ کاکوروی کو لازوال شہرت اور بلندی عطا کر دی۔ محسن کاکوروی کے قصائد میں تخیل کی نزاکت اور بلندی بہت ہے۔ مضامین کی خوبی کے ساتھ ان کے قصائد میں ایک خاص اثر بھی پایا جاتا ہے۔ ساتھ ہی تشبیہات، استعارات اور تلمیحات سے انھوں نے مرزا محمد رفیع سوداؔ کی طرح بڑا حسن پیدا کرنے میں کامیابی حاصل کی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ محسنؔ کاکوروی کے بعد قصیدے کا خاتمہ ہی ہو گیا۔ مگر ان کے معاصرین میں عزیزؔ لکھنوی اور منیرؔ شکوہ آبادی، امیرؔ مینائی اور جلالؔ لکھنوی وغیرہ نے بھی چند اچھے قصائد لکھے۔ تاہم ان میں سے کوئی بھی نازک خیالی، مضمون آفرینی اور قافیہ پیمائی کی حدوں سے باہر نہ نکل سکا۔

اپنی معلومات کی جانچ کیجئے :

۱۔ اردو میں قصیدہ نگاری کی ابتدا کہاں سے ہوئی ؟

(الف) شمالی ہند (ب) دکن

(ج) لکھنو (د) عظیم آباد

۲۔ کس شاعر کو ہجو گوئی سے خاص مناسبت تھی؟

(الف) ذوقؔ (ب) محسنؔ کاکوروی

(ج) غالبؔ (د) سوداؔ

۳۔ ''مدیح خیرالمرسلین'' کے عنوان سے مشہور قصیدہ کس کی تخلیق ہے؟

(الف) مومن خاں مومنؔ (ب) منیرؔ شکوہ آبادی

(ج) امیرؔ مینائی (د) محسنؔ کاکوروی

۴۔ مرزا محمد رفیع سودا کا سال وفات کیا ہے؟

(الف) ۱۷۸۰ء (ب) ۱۷۸۱ء

(ج) ۱۷۸۵ء (د) ۱۷۷۶ء

معروضی سوالوں کے جواب: (۱)ب (۲)د (۳)د (۴)ب

اکائی (۴) اردو قصیدے کے زوال کے اسباب

اردو قصیدہ نگاری کی ابتدا مالی منفعت، حصولِ زر، عزّت و تکریم اور ثوابِ اُخروی وغیرہ کی بنیاد پر ہوئی۔ صلہ و انعام کی لالچ اور ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی خواہش کے نتیجے میں فارسی قصیدہ گویوں کی طرح اردو شعراء کے یہاں بھی زیادہ بلند و دقیق مضامین کی تلاش ایک عام بات ہوگئی، جس نے بلا شبہ بہ اعتبارِ مضمون و اسلوب اردو شاعری کو وسعت و توانائی کی بلندیوں پر پہنچادیا۔ شجاع الدولہ سے لے کر آصف الدولہ تک اور شاہ عالم سے بہادر شاہ ظفر تک کا پورا عہد اندرونی طور پر معاشی مفلوک الحالی کا دور رہا ہے۔ ایسے حالات میں سودا جیسے قادر الکلام اور عظیم ترین فنکار نے بھی ذاتی مدح سرائی میں بزرگان دین کی منقبت اور رسول اکرمؐ کی نعت کو ترجیح دیتے ہوئے اپنی فنکارانہ قابلیت کا مظاہرہ کیا۔ ذوق و غالب نے بہادر شاہ ظفر کے دامن میں پناہ لی اور مادّی اکتساب کیا لیکن ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد یہ سلسلہ قائم نہ رہ سکا اور وہ ممدوحین جو اپنی مدح سننے سے زیادہ شاعر کے کمالِ فن کا اعتراف انعام و اکرام کی صورت میں کرتے تھے، دنیا سے رخصت ہوگئے اور قصیدہ گویوں کو جو سرپرستی امراء نوابوں اور بادشاہوں کی جانب سے حاصل تھی وہ ختم ہونے لگی جس نے بلا شبہ اردو قصیدہ نگاری کے زوال میں سب سے زیادہ اہم رول ادا کیا۔

دلّی کی طرح لکھنؤ کی سرزمین اردو شعر و ادب کا دوسرا اہم مرکز تھی لیکن یہاں کے حالات اور ادبی فضا قصیدے سے کہیں زیادہ مرثیہ گوئی کے لئے موزوں تھی۔ اس لئے قصیدے کی صنف کو خاطر خواہ ترقی میسر نہ آسکی۔ قصیدہ گو شاعروں نے ادبی فضا اور موقع و محل کو نظر میں رکھ کر نوابین اودھ کے مذہبی عقائد اور دلچسپیوں کے مطابق قصیدے کے تمام اجزاء اور اسالیب کو مرثیہ میں ضم کرتے ہوئے اپنی جولانیٔ طبع کے جوہر دکھائے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ قصیدہ گوئی کی جگہ اردو مرثیہ نگاری کو کہیں زیادہ فروغ حاصل ہوا اور قصیدے کی شاہراہ ویران و سنسان ہوتی چلی گئی۔

قصیدے کے زوال کا ایک بڑا سبب یہ بھی تھا کہ ۱۸۷۴ء کے بعد حالی، شبلی، آزاد، اسمٰعیل میرٹھی اور نظم طباطبائی وغیرہ کے ہاتھوں نظم جدید کو بڑا عروج حاصل ہوا۔ مولانا حالی اور اس دور کے تمام اہم شعراء اردو شاعری میں جو نئی تبدیلی چاہتے تھے، وہ قصیدے کے مزاج و اسلوب سے ممکن نہ تھی۔ فطری جذبات اور حقیقت پسندی کا اظہار اس عہد کے شعراء کا اصل منشا و مذاق بن چکا تھا جبکہ اردو قصیدے کی بنیاد مبالغہ اور غلو پر قائم تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ زندگی کے بدلتے ہوئے مزاج کو ہم آہنگ کرنے میں اردو قصائد زیادہ کارآمد ثابت نہ ہوسکے اور اردو شاعری کی یہ غیر معمولی صنف زوال کا شکار ہوگئی۔ اس طرح علی گڑھ تحریک کے زیر اثر اردو شاعری میں سادگی، اصلیت اور جوش کا جو رجحان عام طور پر پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا جانے لگا تھا وہ قصیدہ کے اسلوبیاتی ڈھانچے کو زیادہ راس نہ آسکا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دور شاہی اور نوابین کے خاتمے کے ساتھ اردو قصیدہ نگاری کا بڑی تیزی سے زوال شروع ہوگیا۔

قصیدے کے زوال کا ایک پہلو یہ بھی رہا ہے کہ عموماً اردو قصائد کسی مخصوص شخص کی مدح میں لکھے جاتے رہے۔ اس طرح قصیدے کی یہ صنف کسی اجتماعی حیثیت کی حامل نہ ہوسکی جبکہ وقت کی تبدیلی کے ساتھ تمام ادبی سرمایہ اجتماعی اور جمہوری بنتا گیا۔ اخبار و رسائل، پریس اور عوامی مشاعروں کے فروغ نے شہرت و تشہیر اور معاشی حالات کو بہتر بنانے میں کسی حد تک اردو شعراء کی بڑی مدد کی جس سے بالواسطہ طور پر اردو قصیدہ نگاری پر منفی اثرات مرتّب ہوئے اور اردو شاعری کی یہ شاندار اور توانا صنف ہماری ادبی تاریخ کا

محض ایک یادگار حصہ بن کر رہ گئی۔

اتنا ہی نہیں تقسیم ہند اور ملک کی برطانوی غلامی سے آزادی کے بعد اردو زبان وادب پر جو پیغمبری وقت آن پڑا ہے، اس نے بھی قصیدہ نگاری کی مقبولیت کو بڑی حد تک متاثر کیا ہے۔ یہاں تک کہ اعلیٰ تعلیمی دانش گاہوں میں بھی قصیدے کی تدریس آج بیحد مشکل کام بن چکی ہے۔ اردو زبان کے جاننے اور پڑھنے والوں کا معیار افسوس ناک حد تک گر چکا ہے۔ ایسے میں قصیدہ جیسی مشکل اور رعنائی فکر کی نمائندہ شاعری کے زوال اور اس کے اسباب کو بہ آسانی سمجھا جا سکتا ہے۔

اپنی معلومات کی جانچ کیجئے:

۱۔ لکھنؤ کی ادبی فضا شاعری کی کون سی صنف سخن کے لئے زیادہ موزوں رہی ہے؟

(الف) قصیدہ (ب) مثنوی

(ج) غزل (د) مرثیہ

۲۔ قصیدے کے زوال کا ایک بڑا سبب ہے؟

(الف) جدید نظم نگاری کا آغاز وارتقاء (ب) غزل کی حد سے بڑھتی ہوئی مقبولیت

(ج) مثنویوں میں سماجی زندگی کی بہترین نمائندگی (د) جدید نثری اصناف کا فروغ اور ارتقاء

۳۔ اردو قصیدہ اجتماعی اور جمہوری زندگی سے کتنا قریب ہے؟

(الف) بہت زیادہ قریب ہے۔ (ب) قطعی قریب نہیں۔

(ج) واجبی طور پر تعلق ہے۔ (د) مذکورہ کوئی بھی خیال درست نہیں۔

۴۔ قصیدے کی مقبولیت میں کمی واقع ہونے کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ:

(الف) اس کے پڑھنے والے باقی نہیں رہے۔

(ب) قصیدے کا موضوع نہایت فرسودہ ہو چکا ہے۔

(ج) قصیدہ جمہوری اور اجتماعی زندگی کا عکاسی نہیں۔

(د) قصیدے میں چاپلوسی اور خوشامد کی باتیں ہوتی ہیں۔

معروضی سوالوں کے جواب: (۱)د (۲)الف (۳)ب (۴)ج

خلاصہ:

۱۔ قصیدہ عربی زبان کا لفظ ہے جس میں کسی کی تعریف یا مذمّت کی جاتی ہے۔ مذمّت کو ہجو کہا جاتا ہے۔

۲۔ قصیدے میں شاعر کا اصل مدعا ممدوح کی تعریف کر کے اسے خوش کرنا اور اعتماد میں لینا ہوتا ہے اور جس کے عوض اسے ممدوح سے صلہ وانعام ملنے کی توقع ہوتی ہے۔

۳۔ قصیدے کے اجزائے ترکیبی ہیں: تشبیب، گریز، مدح، عرض مطلب یا مدعا اور دعا۔

۴۔ اردو کے دیگر اصناف کی طرح قصیدے کی ابتداء بھی دکن سے ہوئی۔

۵۔ قصیدے میں نظم ہی کی طرح ایک عنوان ہوتا ہے اور خیالات و مضامین مسلسل اور ایک دوسرے سے مربوط ہوتے ہیں۔

۶۔ قصیدہ میں بہ اعتبار موضوع بڑا تنوّع ہوتا ہے جس میں اخلاق و حکمت، پند و نصائح، کیفیتِ بہار، گردشِ زمانہ، روسا اور بزرگانِ دین کے اوصاف حمیدہ وغیرہ کو موضوعِ سخن بنایا جاتا ہے۔

۷۔ تخیل کی بلندی اور غیر معمولی مبالغہ آرائی بھی قصیدے کے اوصاف و امتیازات ہیں جس کی وجہ سے اردو شاعری کی یہ صنف دل سے زیادہ دماغ کی شاعری کہی جاتی ہے۔

۸۔ اردو کے اہم قصیدہ نگاروں میں مرزا محمد رفیع سوداؔ کے بعد شیخ محمد ابراہیم ذوقؔ، مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ اور محسنؔ کاکوروی کے نام بہ اعتبارِ فکر و فن سب سے زیادہ نمایاں اور بلند ہیں۔

۹۔ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی اور مغلیہ سلطنت کے خاتمے کے بعد قصیدہ گویوں کو جو سرپرستی امراء، نوابوں اور بادشاہوں کی جانب سے میسر تھی وہ ختم ہونے لگی جس نے اردو قصیدہ نگاری کے زوال میں سب سے زیادہ اہم رول ادا کیا۔

۱۰۔ ۱۸۷۴ء کے بعد حالیؔ، شبلیؔ، اور آزادؔ وغیرہ کی کوششوں سے نظم جدید کو جو عروج حاصل ہوا اور شاعری میں حقیقت نگاری و فطری جذبات کے اظہار کی ایک مخصوص فضا قائم ہوئی اس نے مبالغہ اور غلو کی بنیاد پر قائم قصیدے کی بنیاد کو اس قدر کمزور کر دیا کہ اس کا روایتی اسلوبیاتی ڈھانچہ تقریباً مسمار ہو گیا اور اردو شاعری کی یہ توانا و شاندار صنف ہماری ادبی تاریخ کا محض ایک یادگار حصہ بن کر رہ گئی ہے۔

نمونہ امتحانی سوالات

۱۔ قصیدہ کسے کہتے ہیں؟ قصیدے کی اجمالی تاریخ پر روشنی ڈالئے؟

۲۔ قصیدے کے اجزائے ترکیبی مع امثال تحریر کیجئے۔

۳۔ نصاب میں شامل کسی ایک قصیدہ گو کی زندگی کے حالات اور اس کی قصیدہ نگاری کی خصوصیات بیان کیجئے۔

۴۔ اردو قصیدہ کے زوال کے اسباب تحریر کیجئے۔

نصاب کی تیاری میں معاون کتابیں:

۱۔ اردو قصیدہ نگاری کا تنقیدی جائزہ — از پروفیسر محمود الٰہی

۲۔ اردو قصیدہ نگاری — از ڈاکٹر ابو محمد سحر

۳۔ کلیات سوداؔ — مرتبہ ڈاکٹر محمد حسن

۴۔ انتخاب سوداؔ تصحیح و ترتیب: رشید حسن خاں

❑❑❑

بلاک ۲۔ مرثیہ

اکائی ۷: میر انیس کی مختصر سوانح اور فن پر تبصرہ (نمکِ خوانِ تکلم ہے فصاحت میری کا تنقیدی تجزیہ)

ساخت:

میر انیس کی مختصر سوانح

میر ببر علی نام، پہلے حزین پھر انیس تخلص رکھا۔ نومبر ۱۲۱۸ھ مطابق ۱۸۰۳ء میں بمقام فیض آباد پیدا ہوئے۔ والد کا نام میر مستحسن خلیق، دادا میر حسن، پردادا میر ضاحک میر امامی موسوی کے پوتے تھے۔ گویا شعروشاعری کا سلسلہ پانچ پشت سے چلا آ رہا تھا۔ اسی سبب اپنے مرثیہ نمک خوان تکلم ہے فصاحت میری، میں انیس نے کہا ہے ۔

عمر گذری ہے اسی دشت کی سیاحی میں پانچویں پشت ہے شبیر کی مداحی میں

بلاشبہ شعروشاعری کا ماحول میر انیس کو بچپن ہی سے گھر میں ملا اور والد خلیق اپنے وقت کے نامور شاعروں میں شمار ہوتے تھے۔ اس لیے ان کی نگرانی میں شعر گوئی شروع کی پہلے غزلیں کہتے تھے مگر والد کی نصیحت پر اسے ترک کر کے پورے طور پر مرثیہ کو اپنایا۔ فیض آباد کے دوران قیام ہی مرثیہ گوئی میں بڑی شہرت حاصل کر لی تھی کہ فیض آباد سے باہر اور خاص کر لکھنؤ میں مرثیہ پڑھنے کے لیے بلائے جاتے جبکہ اس وقت لکھنؤ میں مرزا دبیر کا شہرہ تھا۔ میر انیس امجد علی شاہ کے دور حکومت میں ۱۸۴۲ء میں مکمل طور پر فیض آباد سے ترک سکونت کر کے لکھنؤ آ گئے اور مرثیہ گوئی میں ایسی شہرت حاصل کی کہ پٹنہ، حیدآباد، بنارس، الہ آباد وغیرہ سے مرثیہ خوانی کے لیے بلائے گئے۔ ۱۸۷۱ء میں حیدرآباد گئے اور وہیں اپنا معرکہ خیر مرثیہ ''بخدا فارس میدان تہور تھا حر'' لکھا۔ اور اردو مرثیہ کو آسمان پر پہنچا دیا۔ مولانا حالی ان کی شاعرانہ عظمت کا اعتراف کرتے ہوے لکھتے ہیں ''میر انیس نے اردو شاعری کو اعلا درجہ پر پہنچا دیا اور بگڑا شاعر مرثیہ گو کے قول کو انیس نے باطل کر دیا۔'' ۱۸۷۴ء میں بمقام لکھنؤ انتقال کیا۔

انیس کی مرثیہ نگاری :

انیس اردو شعروادب کی تاریخ میں ایک زمانہ ساز شخصیت کا نام ہے جس نے مرثیہ جیسی کم مایہ اور غیر اہم صنف شاعری کو اپنی شاعرانہ فنکاری سے بلندی کی اس منزل تک پہنچایا دیا جہاں مرثیہ ادب کی بلند ترین اصناف کا ہم پلہ ہو گیا اور اردو مرثیہ انیس کے بعد آج تک اس بلندی کو دوبارہ نہیں حاصل کر سکا۔ وہ مرثیہ کے بے تاج بادشاہ ہیں۔ پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب کہتے ہیں:

''میر انیس نے مرثیہ گوئی اور مرثیہ خوانی دونوں کو ترقی کی اس منزل پہ پہنچا دیا
جہاں کوئی اب تک نہیں پہنچ سکا۔''[۱]

انیس کے کلام کی گوناگوں خصوصیات اور فن کارانہ مہارت کو سمجھنے کے لیے ان کے ماحول اور سماجی پس منظر کو دیکھنا ضروری ہے کہ ان کو فیض آباد اور لکھنؤ جیسا ماحول ملا جہاں وہ بڑی حسن وخوبی سے مرثیہ کے موضوع، واقعہ کربلا کی مرقع کشی کر سکے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین سابق صدر جمہوریہ ہند کا ارشاد ہے:

''کربلا میں شہادت حسین کا واقعہ ارتقائے انسانی کے عمل کا ایک مہتم بالشان غیر
فانی تاریخی مظاہرہ تھا۔ باطل کے مقابلے میں حق کا، جماعتی مفاسد کے مقابلے میں افراد
صالحہ کا اور بے دینی کے مقابلے میں دین کا مظاہرہ تھا...جس کے حسین حامل تھے۔''[1]

انیس کی شاعری کا موضوع یہی حق ،صداقت اور حرمت کی ایک عظیم الشان قربانی کا بیان ہے جہاں کربلا انسانی روح کی جدو جہد کا ایک جاویداں استعارہ بن گیا ہے۔ پروفیسر آل احمد سرور لکھتے ہیں:

''انیس کی شاعری میں عظمت اس لیے ہے کہ وہ زندگی کی بعض بڑی قدروں کے
علم بردار ہیں۔ یہ قدریں اخلاقی ہیں۔''[2]

انیس کے مرثیوں کا موضوع معرکہ کربلا کا بیان ہے۔ یہ کوئی عام جنگ نہ تھی۔ یہ حق و باطل کے درمیان کی ایک ابدی جنگ تھی جس میں انسانی شرافت اور صداقت کا مقابلہ حیوانی ذلالت و گمراہی سے، اصول پسندی کا مقابلہ مطلب پرستی اور انسان دوستی کا مقابلہ ظلم و جبر سے تھا کہ ایک طرف صرف سو سے کم افراد ہیں اور دوسری طرف ایک کثیر لشکر ہے اور بھوکے پیاسے بچے، بوڑھے سب ہی ہیں ۔جن کا مقابلہ بڑی فوج سے ہے۔ اردو مرثیہ میں اس موضوع کا بیان تو روز اول سے ہی تھا مگر پہلے مرثیہ صرف اظہار عقیدت کا وسیلہ تھا اس میں ادبی وفنی وقار نہ تھا۔ انیس نے مرثیہ کو ادبی وفنی وقار سے آراستہ کیا اور اس کے بیان میں وسعت دی۔ واقعات کربلا کے اپنے بیان میں انیس نے واقعہ نگاری، کردار نگاری، منظر نگاری، جذبات نگاری اور رزمیہ عناصر کو شامل کر کے مرثیہ کو ادب کا لازوال سرمایہ بنا دیا۔ پروفیسر محمد حسن کہتے ہیں:

''انیس کے لیے داستان بیان کرنا ایک معجزہ ہے۔ ایسی داستان جس پر تاریخ کی
مہر مثبت ہو اور مذہبی روایت نے اسے پاکیزہ اور مقدس بنا دیا ہو۔''

(عرض ہنر)

انیس نے اپنے شاعرانہ کمال سے مرثیہ کے بیان کو بہت وسعت دی اور اوپر لکھے سارے موضوعات سے مرثیہ کو آراستہ کیا۔ مولانا شبلی کہتے ہیں:

''انیس نے واقعہ نگاری کو جس کمال تک پہنچایا اردو میں کیا فارسی میں اس کی نظیر ملنا مشکل ہے۔ انیس کے واقعات کے بیان میں مشاہدہ کی باریکی، واقعات کے جزئیات کے بیان سے مکمل تصویر کشی میں جو فنکاری دکھائی ہے اردو شاعری میں نہ تھی۔ ملاحظہ ہو جب جناب عباس نہر فرات پر پہنچتے ہیں گھوڑا پانی دیکھ کر بے تاب ہو جاتا ہے۔ اس لیے کہ دو دن سے پیاسا ہے مگر جناب عباس اس کو روکتے ہیں کیونکہ حسین پیاسے ہیں۔ واقعہ کی صورت دیکھئے۔

دو دن سے بے زباں پہ جو تھا آب و دانا بند　　دریا کو ہنہنا کے لگا دیکھنے سمند
ہر بار کانپتا تھا سمٹتا تھا بند بند　　چمکارتے تھے حضرت عباس ارجمند
تڑپتا تھا جگر کو جو شور آبشار کا

گردن پھرا کے دیکھتا تھا منھ سوار کا

کردار نگاری کے نادر نمونے ملا حظہ ہوں۔ جو انیس سے پہلے مرثیہ میں نایاب ہیں ۔انیس کس نیچرل انداز میں ان کرداروں کو جان دار، فعال اور متحرک شکل میں پیش کرتے ہیں کہ وہ کردار زندہ جاوید ہیں ۔امام حسین کی کردار نگاری کا ایک نمونہ ملا حظہ ہو کہ صبر و رضا کی مکمل تصویر کیسے اپنے شجاعت کا اظہار کرتی ہے ۔

جب رن میں تیغ تول کے سلطان دیں بڑھے　　گیتی کے تھام لینے کو روح الامیں بڑھے
مانند شیر نر کہیں ٹھہرے ،کہیں بڑھے　　گو یا علی الٹتے ہوئے آستیں بڑھے
جلوہ دیا جری نے عروس مصاف کو
مشکل کشا کی تیغ نے چھوڑا غلاف کو

انیس نے اردو مرثیہ کو منظر نگاری کے بہت خوبصورت اور دلکش مناظر سے سجایا ہے اور صنف مرثیہ کو بڑی بلندیوں سے ہم کنار کیا ایک بند ملا حظہ ہو:

وہ دشت، وہ نسیم کے جھونکے، وہ سبزہ زار　　پھولوں پہ جا بجا وہ گہر ہائے آبدار
اٹھنا وہ جھوم جھوم کے شاخوں کا بار بار　　بالائے نخل ایک جو بلبل تو گل ہزار
خواہاں تھے نخل گلشن زہرا جو آب کے
شبنم نے بھر دیے تھے کٹورے گلاب کے

انیس نے اردو مرثیے کو رزم نگاری سے بھی آراستہ کیا، جو اردو مرثیہ کا اہم ترین جز بنا اور انیس کے کلام کا نمایاں پہلو بن کر اردو شعرا ادب کا ایک بے مثال سرمایہ ہے۔ انیس نے معرکہ کربلا کے بیان میں اپنے تخیل کی مدد سے اس کو بالکل اسی طرح پیش کیا ہے جیسے واقعہ صحیح انداز میں رہا ہو یعنی اس کی صداقت اور حقیقت پوری طرح نظر آتی ہے۔ چاہے لڑائی کی تیاری کا بیان ہو یا نقاروں کی گونج یا گھوڑوں کی ٹاپ کی آواز، تلواروں کی چمک دمک۔ نیزوں کی لچک، لڑائی کے داؤں پیچ، سب اپنی اصل حالت میں سامنے آتے ہیں۔ تلوار کی چمک کس طرح پیش کرتے ملا حظہ ہو۔

کیا کیا چمک دکھاتی تھی سر کاٹ کاٹ کے　　تنتی تھی بس تنوں سے زمیں پاٹ پاٹ کے
پانی وہ خود پیئے ہوئے تھی گھاٹ گھاٹ کے　　دم اور بڑھ گیا تھا لہو چاٹ چاٹ کے
کیا جانئے ملا تھا مزہ کیا زبان کو
کھا جاتی تھی ہما کی طرح استخوان کو

ان تمام خوبیوں کے ساتھ انیس کے کلام میں زبان و بیان کی خوبیاں بھی بے مثال ہیں۔ انیس نے اپنے دور کے لکھنؤ کو مدنظر رکھتے ہوئے اپنے کلام کو سادگی کے ساتھ تشبیہات و استعارے سے آراستہ کیا ہے ۔محاوروں کنایوں اور رعایت لفظی کا خوبصورت انتظام میں رکھا اور کلام کے لفظی و معنوی حسن کو بڑھایا ہے۔ ملا حظہ ہو ۔

پیاسی جو تھی سپاہ خدا تین رات کی ساحل سے سر پٹکتی تھیں موجیں فرات کی (حسن تعلیل)

دریا دلی سے بحر کو قطرہ سمجھتے تھے (مراعاۃ النظیر)

پانی میں تھے نہنگ، ابھرتے نہ تھے مگر (رعایت لفظی)

انیس نے ایسی زبان، ایسا لہجہ، ایسے محاورات استعمال کیے جو آج بھی اردو شعرا کے لیے نشان راہ ہیں۔ بلاشبہ انیس کے کلام کے شاعرانہ حسن نے اردو زبان کو اسعتیں اور توانائیاں عطا کی ہیں اور مرثیہ جیسی صنف میں اردو شاعری کی تمام اصناف کی عمدہ صفات یکجا کر دیں ہیں۔ جس کا اردو شاعری میں کوئی جواب نہیں ہے وہ اردو ہی کے نہیں بلکہ دنیا کے عظیم شاعروں میں شمار ہوتے ہیں۔

❑❑❑

انیس کا مرثیہ : نمک خوان تکلم ہے فصاحت میری (انتخاب متن)

متن مرثیہ (انتخاب)

نمکِ خوانِ تکلم، ہے فصاحت میری ناطقے بند ہیں، سن سن کے بلاغت میری

رنگ اڑتے ہیں، وہ رنگیں ہے عبارت میری شور جس کا ہے، وہ دریا ہے طبیعت میری

عمر گزری ہے اسی دشت کی سیاحی میں

پانچویں پشت ہے شبیر کی مداحی میں

ایک قطرے کو جو دوں بسط، تو قلزم کر دوں بحر مواج فصاحت کا، تلاطم کر دوں

ماہ کو مہر کروں، ذرّے کو انجم کر دوں گُنگ کو ماہر اندازِ تکلم کر دوں

دردِ سر ہوتا ہے، بے رنگ نہ فریاد کریں

بلبلیں، مجھ سے گلستاں کا سبق یاد کریں

مبتدی ہوں، مجھے توقیر عطا کر یا رب شوقِ مدّاحِ شبیر عطا کر یا رب

سِلکِ گوہر ہو، وہ تقریر عطا کر یا رب نظم میں رونے کی تاثیر عطا کر یا رب

جدّ و آبا کے سوا اور کی تقلید نہ ہو

لفظ مغلق نہ ہوں، گنجلک نہ ہو، تعقید نہ ہو

روزمرہ شرفا کا ہو، سلاست ہو وہی لب و لہجہ وہی سارا ہو، متانت ہو وہی

سامعیں جلد سمجھ لیں جسے، صنعت ہو وہی یعنی موقع ہو جہاں جس کا، عبارت ہو وہی
لفظ بھی چست ہوں، مضمون بھی عالی ہووے
مرثیہ درد کی باتوں سے نہ خالی ہووے

بزم کا رنگ جدا، رزم کا میداں ہے جدا یہ چمن اور ہے، زخموں کا گلستاں ہے جدا
فہم کامل ہو، تو ہر نامے کا عنواں ہے جدا مختصر پڑھ کے رلا دینے کا ساماں ہے جدا
دبدبہ بھی ہو،مصائب بھی ہوں، توصیف بھی ہو
دل بھی محظوظ ہوں، رقت بھی ہو، تعریف بھی ہو

ماجرا صبح شہادت کا بیاں کرتا ہوں رنج و اندوہ و مصیبت کا بیاں کرتا ہوں
تشنہ کاموں کی عبادت کا بیاں کرتا ہوں جاں نثاروں کی اطاعت کا بیاں کرتا ہوں
جن کا ہمتا نہیں، ایک ایک مصاحب ایسا
ایسے بندے نہ کبھی ہوں گے، نہ صاحب ایسا

صبح صادق کا ہوا چرخ پہ جس وقت ظہور زمزمے کرنے لگے، یادِ الٰہی میں طیور
مثلِ خورشید برآمد ہوئے خیمے سے حضور یک بیک پھیل گیا چار طرف دشت میں نور
شش جہت میں رخِ مولا سے ظہورِ حق تھا
صبح کا ذکر ہے کیا، چاند کا چہرہ فق تھا

آئے سجادۂ طاعت پہ امامِ دو جہاں اُس طرف طبل بجے، یاں ہوئی لشکر میں اذاں
وہ مصلی کہ زباں جن کی حدیث و قرآں وہ نمازی کہ جو ایماں کی تنِ پاک کی جاں
زاہد ایسے تھے، کہ ممتاز تھے ابراروں میں
عابد ایسے تھے، کہ سجدے کئے تلواروں میں

کیا جوانانِ خوش اطوار تھے، سبحان اللہ کیا رفیقانِ وفادار تھے، سبحان اللہ
صفدر و غازی و جرار تھے، سبحان اللہ زاہد و عابد و ابرار تھے، سبحان اللہ
زن و فرزند سے فرقت ہوئی، مسکن چھوڑا
مگر احمدؐ کے نواسے کا نہ دامن چھوڑا

جب، فریضے کو ادا کر چکے وہ خوش اطوار کس کے کمروں کو بہ صد شوق لگائے ہتھیار
جلوہ فرما ہوئے گھوڑے پہ شہ عرش وقار علمِ فوج کو عباس نے کھولا اک بار
دشت میں نکہتِ فردوسِ بریں آنے لگی

عرش تک اس کے پھریرے کی ہوا جانے لگی

یک بہ یک طبل بجا فوج میں گرجے بادل　　کوہ تھرائے، زمیں ہل گئی، گونجا جنگل
پھول ڈھالوں کے چمکنے لگے، تلواروں کے پھل　　مرنے والوں کو نظر آنے لگی شکل اجل

واں کے چاؤش بڑھانے لگے دل لشکر کا
فوج اسلام میں نعرہ ہوا یا حیدر کا

شور میدانیوں میں تھا، کہ دلیرو نکلو!　　نیزہ بازی کروم رہواروں کو پھیرو نکلو!
نہر قابو میں ہے، اب پیاسوں کو گھیرو نکلو!　　غازیو صف سے بڑھو، غول سے شیرو نکلو!

رستمو! داد وغا دو، کہ یہ دن داد کا ہے
سامنا حیدر کرار کی اولاد کا ہے

شور سادات میں تھا، یا شہ مرداں مدد ے!　　کعبۂ دیں مدد ے، قبلۂ ایماں مدد ے!
قوت بازوئے پیغمبر ذی شاں مدد ے!　　دم تائید ہے، اے فخر سلیماں مدد ے!

تیسرا فاقہ ہے، طاقت میں کمی ہے مولا!
طلبِ قوتِ ثابت قدمی ہے مولا!

سامنے بڑھ کے یکا یک صف کفار آئی　　جھوم کر تیرہ گھٹا، تاروں پہ اک بار آئی
روز روشن کے چھپانے کو شب تار آئی　　تشنہ کاموں کہ طرف تیروں کی بوچھار آئی

ہنس کے، منھ بھائی کا، شاہ شہدا نے دیکھا
اپنے آقا کو، بہ حسرت، رفقا نے دیکھا

عرض عباس نے کی، جوش ہے جراروں کو　　تیر سب کھاتے ہیں، تولے ہوئے تلواروں کو
میہمانوں کا نہیں پاس، ستم گاروں کو　　مصلحت ہو تو رضا دیجئے، غم خواروں کو

روسیاہوں کو ہٹا دیں، کہ بڑھے آتے ہیں
ہم جو خاموش ہیں، تو منھ پہ چڑھے آتے ہیں

شہ نے فرمایا، مجھے خود ہے شہادت منظور　　نہ لڑائی کی ہوس ہے، نہ شجاعت کا غرور
ان سے منظور نہ تھی جنگ، پر اب ہیں مجبور　　خیر لڑ لو، کہ ستاتے ہیں یہ بے جرم و قصور

ذبح کرنے کے لئے لشکر ناری آئے
کہیں جلدی مرے سر دینے کی باری آئے

حکم پانا تھا، کہ شیروں نے اڑائے تازی　　مثل شہباز گیا، ایک کے بعد اک غازی

واہ رے حرب، خوشا ضرب، زہے جاں بازی اڑ گیا ہاتھ، بڑھائے جو پئے دست اندازی
تن و سر، لوٹتے ریتی پہ نظر آتے تھے
ایک حملے میں، قدم فوج کے اٹھ جاتے تھے

جس پہ غصے میں گئے، صید پہ شہباز گرا یہ کماں کٹ کے گری، وہ قد انداز گرا
جب گرا خاک پہ گھوڑے سے، تو ممتاز گرا نہ اٹھا پھر کبھی، جو تفرقہ پرداز گرا
ہاتھ منہ کٹ گئے، سراڑ گئے، جی چھوٹ گئے
مورچے ہو گئے پامال، پرے ٹوٹ گئے

یہی ہنگامہ رہا صبح سے تا وقت زوال لاش پر لاش گری بھر گیا میدان قتال
مورچے سب تہہ و بالا تھے، پرے سب پامال سرخ رو خلق سے اٹھے، اسد اللہ کے لال
کھیت ایسے بھی کسی فوج میں کم پڑتے ہیں
جو لڑا، سب یہی سمجھے، کہ علی لڑتے ہیں

دوپہر میں وہ چمن باد خزاں نے لوٹا پتا پتا ہوا تاراج، تو بوٹا بوٹا
باپ بیٹے سے چھٹا، بھائی سے بھائی چھوٹا ابن زہرا کی کمر جھک گئی، بازو ٹوٹا
پھر نہ یاور، نہ وہ جاں باز، نہ وہ شیدا تھے
ظہر کے وقت حسین ابن علی تنہا تھے

بڑھ کے چلاتے تھے بے درد، کہ اب آپ آئیں جوہرِ تیغِ شہنشاہِ نجف دکھلائیں
مرنے والے نہیں جیتے کہ سنانیں کھائیں کاٹ لیں آپ کا سر تن سے، تو فرصت پائیں
پسر سعد سے وعدہ ہے، صلہ لینے کا
حکم ہے، خیمۂ اقدس کے جلا دینے کا

شہہ نے فرمایا کہ سر کاٹ لو، حاضر ہوں میں نہ تو لڑنے میں، نہ مرجانے میں، قاصر ہوں میں
فوج بھی اب نہیں، بے یاور و ناصر ہوں میں شہر و صحرا بھی تمہارا ہے، مسافر ہوں میں
لوٹ لو، پھونک دو، تاراج کرو بہتر ہے
کلمہ گویو! یہ تمہارے ہی نبی کا گھر ہے

کئی سیدانیاں خیمے میں ہیں، پردے والی جن کا رتبہ ہے زمانے میں، ہر اک پر حالی
اب نہ وارث ہے کوئی سر پہ، نہ کوئی والی ان کو دیکھو، کوئی رہ جائے جو خیمہ خالی
یہ نبی زادیاں، بے پردہ نہ ہوویں جس میں

ایک گوشہ ہو، کہ سب بیٹھ کے روئیں جس میں

سن کے ان باتوں کو، اعدا نے دیا جو کہ جواب　　گر لکھوں اس کو، تو ہو جائے جگر سنگ کا آب
قلب تھرا گیا، ہرگز نہ رہی ضبط کی تاب　　دیکھ کر رہ گئے گردوں کو، شہہ عرش جناب

اشک خالی اسے کرتے ہیں جو دل بھر آئے
آپ رونے کلے لئے خیمے سے در پر آئے

تھم کے چلائے کہ اے زینب و ام کلثوم　　تم سے رخصت کو ، پھر آیا ہے حسینِ مظلوم
اب مرے قتل کے درپے ہے یہ سب لشکر شوم　　ہاں جگا دو اسے غش ہو جو سکینہ معصوم

نہیں ملتا جو زمانے سے گزر جاتا ہے
کہہ دو عابد سے کہ مرنے کو پدر جاتا ہے

یہ صدا سن کے حرم خیمے سے مضطر دوڑے　　شہ کی آواز پہ سب بے کس و بے پر دوڑے
گر پڑیں سر سے ردائیں، تو کھلے سر دوڑے　　بچے روتے ہوئے، ماؤں کے برابر دوڑے

رو کے چلائی سکینہ، شہ والا، آؤ
میں تمھیں ڈھونڈتی تھی دیر سے بابا آؤ

دیکھ کر پردے سے کہنے لگی زینبِ زار　　ابن زہرا تری مظلومی و غربت کے نثار
آؤ چادر سے کروں پاک میں چہرے کا غبار　　شہ نے فرمایا بہن! مر گئے سب مونس و یار

تم نے پالا تھا جسے ہم اسے رو آئے ہیں
علی اکبر سے جگربند کو کھو آئے ہیں

کہیو عابد سے، یہ پیغام مرا بعد سلام　　غش تھے تم، پھر گئے دروازے تلک آ کے امام
قید میں پھنس کے نہ گھبرائیو، تم اے گلفام　　کاٹیو صبر و رضا سے سفر کوفہ و شام

ناؤ منجھدھار میں ہے، شور تلاطم جانو
ناخدا جاتا ہے، گھر جانے، بس اب تم جانو

کہہ کے یہ باگ پھرائی طرف لشکر شام　　پڑ گیا خیمۂ ناموس نبی میں کہرام
رن میں گھوڑے کو اڑاتے ہوئے آئے جو امام　　رعب سے فوج کے دل ہل گئے کانپے اندام

سر جھکے ان کے جو کامل تھے زباں دانی میں
اڑ گئے ہوش فصیحوں کے رجز خوانی میں

تھا یہ نعرہ کہ محمد کا نواسا ہوں میں　　مجھ کو پہچانو کہ خالق کا شناسا ہوں میں

زخمی ہونے سے، نہ مرنے سے ہراساں ہوں میں تیسرا دن ہے یہ گرمی میں کہ پیاسا ہوں میں

چین کیا چیز ہے آرام کسے کہتے ہیں
اس پہ شکوہ نہیں کچھ صبر اسے کہتے ہیں

اس کا پیارا ہوں، جو ہے ساقی حوض کوثر اس کا بیٹا ہوں، جو ہے فاتح بابِ خیبر
اس کا فرزند ہوں، کی جس نے مہم بدر کی سر اس کا دلبر ہوں میں، دی جس کو نبی نے دختر

صاحب تخت ہوئے، تیغ ملی، تاج ملا
دوش احمد پہ انھیں رتبۂ معراج ملا

نہ ابھی ختم ہوئی تھی یہ مسلسل تقریر حجت اللہ کے فرزند پہ چلنے لگے تیر
چوم کر تیغ کے قبضے کو پکارے شبیر لو خبردار چمکتی ہے علی کی شمشیر

پسرِ فاتحِ صفین و حنین آتا ہے
لو، صفیں باندھ کے روکو تو حسین آتا ہے

آپ سیدھے جو ہوئے رخش نے بدلے تیور دونوں آنکھیں ابل آئیں کہ ڈرے بانیٔ شر
تھوتھنی مل گئی سینے سے کیا دم کو چنور مثلِ طاؤس اڑا، گاہ اِدھر گاہ اُدھر

دم بہ دم گرد نسیم سحری پھرتی تھی
جھوم کے پھرتا تھا گویا کہ پری پھرتی تھی

ابر ڈھالوں کا اٹھا، تیغِ دو پیکر چمکی برق چھپتی ہے، یہ چمکی تو برابر چمکی
سوئے پستی کبھی کوندی، کبھی سر پر چمکی کبھی انبوہ کے اندر، کبھی باہر چمکی

جس طرف آئی وہ ناگن، اسے ڈستے دیکھا
منھ سروں کا صف دشمن پہ برستے دیکھا

کبھی چہرہ، کبھی شانہ، کبھی پیکر کاٹا کبھی در آئی گلے میں، تو کبھی سر کاٹا
کبھی مغفر، کبھی جوشن، کبھی بکتر کاتا طول میں راکب و مرکب کو برابر کاٹا

برش تیغ کا غل، قاف سے تا قاف رہا
پی گئی خون ہزاروں کا پہ منہ صاف رہا

جو رکی خود پہ وہ، اور نہ وہ سر پر ٹھہری نہ رکی تیغ پہ دم بھر، نہ سپر پر ٹھہری
نہ جبیں پر، نہ گلے پر، نہ جگر پر ٹھہری کاٹ کر زین کو، نہ گھوڑے کی کمر پر ٹھہری

غُل تھا بھاگو، کہ یہ ہنگام ٹھہرنے کا نہیں

زہر اس کا جو چڑھے گا، تو اترنے کا نہیں

کٹ گئی، تیغ تلے جب صف دشمن آئی　　یک بہ یک فصلِ فراقِ سر و گردن آئی
بگڑی اس طرح لڑائی، کہ نہ کچھ بن آئی　　تیغ کیا آئی، کہ اڑتی ہوئی ناگن آئی
جان گھبرا کے تنِ دشمنِ دیں سے نکلی
ہاتھ بھر ڈوب کے تلور زمیں سے نکلی

تنِ تنہا شہ دیں لاکھ سواروں سے لڑے　　بے سپر، برچھیوں والوں کی قطاروں سے لڑے
صورتِ شیرِ خدا، ظلم شعاروں سے لڑے　　دو سے اک لڑ نہیں سکتا، یہ ہزاروں سے لڑے
گر ہو غالب، تو ہزاروں پہ وہی غالب ہو
جو دل و جانِ علی ابن ابی طالب ہو

ہر طرف فوج میں غُل تھا کہ دہائی مولا!　　ہم نے دیکھی ترے ہاتھوں کی صفائی مولا!
الاماں! خوب سزا جنگ کی پائی مالا!　　آپ کرتے ہیں بروں سے بھی بھلائی مولا!
ہاتھ ہم باندھتے ہیں، پھینک کے شمشیروں کو
بخشیے! امت نااہل کی تقصیروں کو

آئی ہاتف کی یہ آواز، کہ اے عرش مقام　　یہ وغا تیسرے فاقے میں بشر کا نہیں کام
اے محمد کے جگربند، امام ابن امام　　لوح محفوظ پہ مرقوم ہے صابر ترا نام
اب نہیں حکم لعینوں سے وغا کرنے کا
ہاں، یہی وقت ہے وعدے کے وفا کرنے کا

تھم گئے سن کے یہ آواز شہ جن و بشر　　روک کر تیغ کو، فرمایا کہ حاضر ہے یہ سر
عید ہو جلد اگر ذبح کریں بانی شر　　شمر اظلم ہے کدھر؟ کھینچ کے آئے خنجر
ہے وہ عاشق، جو فدا ہونے کو موجود رہے
بس مری فتح یہی ہے کہ وہ خوشنود رہے

کہہ کے یہ، میان میں مولا نے رکھی تیغ دو دم　　ہاتھ اٹھا کر یہ اشارت کیا گھوڑے سے کہ تھم
رہ گیا سر کو ہلا کر فرس تیز قدم　　چار جانب سے مسافر پہ چلے تیر ستم
نیزے یوں گرد تھے، جیسے گل تر خاروں میں
چھپ گئے سبط نبی ظلم کی تلواروں میں

پہلے تیروں سے کماں داروں نے چھاتی چھانی　　نیزے پہلو پہ لگاتے تھے ستم کے بانی

سر پہ تلواریں چلیں، زخمی ہوئی پیشانی خوں سے تر ہو گیا حضرت کا رخِ نورانی
جسم سب چور تھا، پرزے تھے زرہ جامے کے
پیچ کٹ کٹ کے کھلے جاتے تھے عمامے کے

ہاتھ سے باگ جدا تھی، تو رکابوں سے قدم غش میں سیدھے کبھی ہوتے تھے فرس پر کبھی خم
بہتے تھے پہلوؤں سے خوں کے دریڑے پیہم کوئی بے کس کا مددگار نہ تھا، ہائے ستم
مارے تلواروں کے مہلت نہ تھی دم لینے کی
کوششیں ہوتی تھی کعبے کو گرا دینے کی

نہ رہا جب، کہ ٹھہرنے کا فرس پر یارا گر پڑا خاک پہ، وہ عرش خدا کا تارا
غش سے کچھ دیر میں چونکا، جو علی کا پیارا نیزہ سینے پہ سنان ابن انس نے مارا
واں تو نیزے کی انی پشت سے باہر نکلی
یاں بہن خیمے کی ڈیوڑھی سے کھلے سر نکلی

کھینچ کر سینے سے نیزہ جو بڑھا دشمنِ دیں جھک کے حضرت نے رکھی خاک پہ سجدے میں جبیں
تیز کرتا ہوا خنجر کو بڑھا شمر لعیں آسماں ہل گئے، تھرا گئی مقتل کی زمیں
کیا کہوں تیغ کو، کس طرح گلے پر رکھا
پاؤں قرآں پہ رکھا، حلق پہ خنجر رکھا

ڈھانپ کر ہاتھوں سے منہ بنت علی چلائی ذبح کرتے ہو مرے سامنے ہے ہے بھائی
ضرب اول تھی، کہ تکبیر کی آواز آئی گر پڑی خاک پہ غش کھا کے علی کی جائی
اُٹھ کے دوڑی تھی کہ ہنگامۂ محشر دیکھا
منھ کو کھولا تو سر شہ کو سناں پر دیکھا

بس انیس! آگے نہ لکھ زینب ناشاد کے بین قتل ہو جانے پہ بھی دھوپ میں تھی لاشِ حسین
قبر میں بھی نہ ملا احمد مختار کو چین گھر جلا، قید ہوئی، آل رسول الثقلین
کتنے گھر، شاہ کے لٹ جانے سے برباد ہوئے
لٹ گئے یوں، کہ نہ سادات پھر آباد ہوئے

اپنی معلومات کی جانچ کیجیے:

۱۔ یہ مرثیہ کس کی شان میں کہا گیا ہے؟

۲۔ ''پانچویں پشت ہے شبیر کی مداحی میں'' کیسے؟ جواب دیجئے۔

۳۔ ماجرا مرثیے کا کون سا جز نمبر ہے؟

۴۔ پسر سعد کون ہے؟

۵۔ ''واں کے چاؤش بڑھانے کے دل لشکر کے'' کی وضاحت کیجئے۔

۶۔ انیسؔ کے والد کا کیا نام ہے اور انیسؔ کہاں پیدا ہوئے تھے؟

متن کا تجزیہ

یہ مرثیہ جناب امام حسین کی شان میں ہے اور میر انیس کے بہترین مرثیوں میں ایک ہے۔ مرثیہ کے فارم کے لحاظ سے اس مرثیہ میں مرثیہ کے سب ہی دسوں اجزا یعنی (۱) چہرہ (۲) ماجرا (۳) سراپا (۴) رخصت (۵) آمد (۶) رجز (۷) جنگ (۸) شہادت (۹) بین (۱۰) دعا۔ موجود ہیں۔

عام طور سے یہ مشہور ہے کہ یہ مرثیہ انیس نے اپنے صاحب زادے رئیس کو کہہ کر دیا تھا لیکن اس پایہ کا مرثیہ ہونے کے سبب ان کے منھ پر کیسے پھبتا۔ لہذا انیس نے اس کو لے لیا اور ''پانچویں پشت ہے شبیر کی مداحی میں'' نہیں بدل سکے۔ لیکن اس مفروضے کو زیادہ صحیح نہیں کہا جا سکتا۔

تشریح :

پہلا بند چہرہ کا ہے اس میں قصیدہ کی تشبیب کی طرح شاعر کو دنیا کا کوئی مضمون باندھنے کی آزادی ہوتی ہے۔ اس بند میں انیس کہتے ہیں کہ میرا کلام گفتگو کے دسترخوان کا نمک رکھتا ہے۔ اسی سے کلام میں فصاحت پیدا ہوتی ہے اور میرے عالمانہ بیان کو سن کر سب حیرت زدہ رہ جاتے ہیں۔ ناطقے بند ہونا محاورہ ہے کہ سب کے ہوش اڑ جاتے ہیں۔ ویسے ہی میرے کلام کے لفظ و عبارت میں بھی رنگینی رہتی کہ لوگوں کو لطف آتا ہے۔ میں ایک پر گو شاعر ہوں اور میرے اشعار کی وہ آمد ہے کہ جیسے تیز بہتا ہوا دریا ہو۔ اور ایسا کیوں نہ ہو اس لیے کہ عمر اسی شعر و شاعری اور مرثیہ گوئی میں گزاری ہے اور پانچ پشت سے میرے یہاں جناب امام حسین کی مدح اور شان میں مراثی لکھے جا رہے ہیں۔

دوسرا بند: میں ایک قادر الکلام شاعر ہوں کہ اگر ایک قطرے کو وسعت دوں تو سمندر بنا دوں اور کلام موجیں مارتا شور مچاتا ہوا سمندر نظر آئے۔ چاند کو سورج اور ذرے کو ستارہ بنا دوں میں اپنے فن شعر گوئی سے گونگے کو بھی تکلم میں یعنی گفتگو میں ماہر بنا دوں اس لیے بے رنگ شاعری دیکھ کر دردسر ہونے لگتا ہے اگر شاعری کرنا ہے تو مجھ سے لوگ سیکھیں میں بلبلوں کو گلستاں کا سبق یاد کراتا ہوں میں چہکتا ہوا شاعر بناتا ہوں۔

تیسرا بند: اے خدا میں ابھی مبتدی ہوں یعنی شاعری کے میدان میں ابتدا کر رہا ہوں۔ (اس مرثیہ کو انیس نے اپنے بیٹے رئیس کو پڑھنے کے لیے دے دیا تھا۔ اس لئے اس بند میں انیس کے صاحبزادے رئیس کہہ رہے ہیں) حضرت امام حسین کی تعریف کا

شوق دے اور تقریر کا وہ جوہر عطا کر دے کہ کلام و بیان موتی معلوم ہوں اور چونکہ مرثیہ لکھ رہا ہوں اس لئے جہاں مصائب کا موقع آئے تو بیان ایسا درد بھرا ہو کہ رونے کے اثرات بھی پیدا ہو جائیں۔ اگر کبھی شاعری میں تقلید کی ضرورت پڑے تو باپ دادا کی ہی ہو غیروں کی نہ ہو کلام سیدھے سادے الفاظ کا ہو، سادگی ہو، مغلق یعنی بھاری بھرکم لفظ نہ ہوں، معنی میں کوئی پیچیدگی نہ ہوتا کہ سمجھنے میں کوئی پھیر ہو۔

چوتھا بند: چوتھے بند میں شاعر کہتا ہے کہ میری شاعر عام فہم ہو۔ یعنی شاعری میں روزمرہ جو شریف لوگ بولتے ہیں وہی لب ولہجہ ہو اور ویسی ہی سنجیدگی ہو کہ سننے والے جلد سمجھ لیں یعنی جس موقع کی عبارت کی ضرورت ہو ویسی ہی عبارت شاعری میں آئے اور چونکہ مرثیہ کا معاملہ ہے اس لئے مضمون بھی عالی رہے زبان بھی چست رہے کہ کربلا والوں کے واقعات کا بیان ہے اس لیے درد سے خالی نہ رہے۔

پانچواں بند: اس بند میں وہ کہتے ہیں کہ شاعری میں ایک اصول اور بھی ہے کہ محفل کے بیان کا انداز اور ہوتا ہے اور جنگ کے میدان کا بیان دیگر انداز میں ہوتا ہے۔ محفل کا چمن اور ہے اور جنگ کا چمن تو زخموں سے سجایا جاتا ہے اس لیے ویسے ہی لفظ ہونا ضروری ہے اور سمجھ داری ہو تو ہر نامے کا یعنی ہر خط کا عنوان جدا ہوتا ہے۔ مرثیہ میں رلانے والی منزل آتی ہے تو تھوڑے سے مصائب بیان کر دینے سے بھی کام چل جاتا ہے لیکن ایک اچھا مرثیہ وہی ہوگا جس میں سب کچھ ہو شان و بہادری کی بات بھی ہو، درد کا پہلو بھی ہو اور جس پر مرثیہ لکھا گیا ہے اس کی تعریف بھی ہو جائے، اس سے ہر سننے والے کا دل بھی خوش ہو جائے گا۔ ضرورت پڑنے پر دو آنسو بھی نکلیں گے اور مرثیہ کے ہیرو کی تعریف بھی ہو جائے گی۔

چھٹواں بند: چہرہ کے جزو کے بیان کے بعد شاعر مرثیہ کے دوسرے جز ماجرا میں داخل ہو جاتا ہے اور زیر نظر چھٹواں بند ماجرا کا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ میں اس بند میں واقعہ، صبح شہادت یعنی محرم کی دسویں تاریخ جو کربلا والوں کے لئے شہادت کا دن ہے اس عاشورہ کے صبح کا ماجرا بیان کر رہا ہوں۔ اس کو رنج اندوہ و مصیبت کا بیان سمجھنا چاہئے۔ یہ کربلا کے میدان میں تین روز کے پیاسوں کی عبادت کا بیان ہے اور امام حسین کے ساتھ ان کے بہتر (۷۲) ساتھیوں کی جانثاری کا بیان ہے، جن کا دنیا میں کوئی مثل نہیں سب ایسے تھے۔ کربلا کے سارے اصحاب وانصار و جانثار اور امام حسین دنیا کے لئے بے مثال انسانوں میں تھے۔

ساتوویں بند میں شاعر کہتا ہے کہ شب عاشورہ گزرنے کے بعد جب صبح صادق نمودار ہوئی یعنی رات گزر گئی اور صبح ہو گئی تو فضا میں طیور بھی یاد الٰہی میں مصروف نظر آئے۔ کیوں اسلئے کہ امام حسین اور اصحاب حسین سب یاد الٰہی میں شب بھر مشغول رہے۔ اب صبح نمودار ہونے کے ساتھ یاد الٰہی سے فراغت ہو کر امام حسین مثل خورشید اپنے خیمے سے برآمد ہوئے تو ان کے نور سے کربلا کے دشت میں یک بیک روشنی پھیل گئی۔ اور چھنوں سمت میں رخ مولا یعنی امام حسین کے چہرے کی روشنی سے روشنی ہی روشنی تھی۔ صبح کا کیا ذکر کیا جائے، صبح تو روشن ہوئی ہی رخ مولا کے ظہور سے چاند کا چہرہ فق تھا یعنی چاند کی چمک ماند پڑ گئی تھی۔ ظاہر ہے کہ صبح ہو جانے کے بعد چاند کی چمک ہلکی ہو جاتی ہے۔ یہاں پر انیس نے صفت حسن تعلیل سے کام لیا ہے۔ چاند کی چمک ہلکی ہو جانے کا سبب کچھ اور ہے شاعر نے کچھ دیگر بتایا ہے۔

آٹھویں بند میں شاعر کہتا ہے کہ سجادہ طاعت پہ امام حسین تشریف لائے اور ادھر کربلا والے تو نماز فجر کی تیاری کر رہے ہیں اور اس فوج مخالف والے اعلان جنگ کر رہے ہیں۔ طبل بجنا کے معنی ہیں جنگ کا اعلان ہونا اور یہاں امام حسین کے لشکر میں اذان دی جاری ہے۔ یہ وہ نمازی ہیں کہ جن کی زبان حدیث وقران کا مرتبہ رکھتی ہے اور یہ نمازی جناب رسول خدا کی جان کے برابر کا رتبہ رکھتے ہیں۔ رسول کہا کرتے تھے کہ حسین مجھ سے ہے اور میں حسین سے ہوں۔ یہ ایسے پاک و پاکیزہ تھے کہ تمام پاک و پاکیزہ لوگوں سے برتر تھے اور عبادت گزار ایسے تھے کہ سجدے تلواروں میں کئے۔

نویں بند میں شاعر کہتا ہے کہ امام حسین کے ساتھ کیسے کیسے خوبصورت اور خوب سیرت جوانان تھے کہ سارے کے سارے حسین کے ساتھی نمازی تھے، بہادر تھے، پاک طبیعت و پاک سیرت تھے۔ رسول کے عاشق تھے کہ دنیا میں سب کچھ چھوڑنے کو تیار ہوئے مگر نواسۂ رسول کا ساتھ نہ چھوڑنے پر آمادہ ہے۔

اگلے (دسویں) بند میں شاعر کہتا ہے کہ جب سب نماز ادا کر چکے اور کوئی صورت جنگ سے بچنے کی نہ رہی تو سبھوں نے کمریں کسیں،، ہتھیار جنگ بدن پر سجائے، گھوڑے تیار کیے اور جناب عباس جو حسینی فوج کے علم بردار مقرر ہوئے تھے انھوں نے اپنے پرچم کو کھولا تو چونکہ وہ رسول خدا کا پرچم تھا اس لیے کربلا کے دشت میں فردوس کی خوشبو آنے لگی اور آسمان تک اس پرچم کی ہوا جانے لگی۔

اچانک فوج مخالف میں جنگ کا طبل بجنے لگا اور ایسی گھن گرج کے ساتھ کہ پہاڑ و زمین بھی دہل جائے اور ڈھال و تلوار سب ایسا چمکنے لگے کہ امام حسین کے ساتھیوں کو موت سامنے نظر آنے لگی۔ شاعر نے یہاں خوبصورت صفت رعایت لفظی سے کام لیا ہے۔ ڈھالوں کی چمک پھول ہوئی اور تلواروں کی دھار کو پھل کہا جاتا ہے۔ پھول کی رعایت سے پھل شاعرانہ صفت ہے۔

بند گیارہ : پھول اور پھل میں صنعت ایہام ہے۔

چاوش معنی میدان جنگ میں سپاہیوں کو جوش دلانے والی باتیں۔

بند بارہ : شاعر کہتا ہے کہ اس طرف فوج دشمن میں اپنے فوجی سپاہیوں کو تیار ہو کر نکلنے کا شور ہو رہا تھا اور نیزہ بازی کرنے، گھوڑوں کو دوڑا کر جنگ کے لیے تیار کرنے کی مشق ہو رہی تھی۔ اس اعلان کے ساتھ کہ نہر علقمہ جس پر کربلا والے ٹھہرے ہوئے تھے وہ اب ہمارے قبضہ میں ہے۔ اب حسین کے سپاہیوں کو گھیر لیا جائے۔ اے فوج کے بہادرو، اے رستمو! آج کا یہ دن محرم کی دسویں تاریخ ۶۱ھ دادکی ہے یعنی ہم سب ایک دوسرے کی مدد سے لڑیں۔ اس لیے کہ سامنے مقابلے میں حیدر کرار، جو رسول خدا کی فوج کے سردار تھے اور کبھی جنگ نہیں ہاری آج ان کی اولادوں سے مقابلے کا دن ہے پوری طرح تیار ہو کر سامنے آجاؤ۔

بند تیرہ : اور اس طرف امام حسین کی جانب شور سادات میں تھا۔ یعنی جناب رسول خدا کی اولادوں میں یہ شور تھا کہ یا شہ مرداں یعنی اے علی مدد کو آؤ، اے دین کے کعبہ اور ایمان کے قبلہ، اے جناب رسول خدا کے قوت بازو علی، مدد کو آیئے، یہ وقت ہمیں جو رسول کی طرف سے دین کے بچانے کے لئے جان دینے کی تائید ہے اس کا ہے۔ ہم سب آپ کی مدد سے جان دینے کو تیار ہیں حالانکہ آج تیسرے فاقہ سے ہیں اس لیے کہ فوج جفا کار نے محرم کی سات تاریخ سے ہمارا دانہ پانی بند کر رکھا ہے اس لیے یا مولا آپ سے

ثابت قدم رہنے کی دعا کے طالب ہیں۔

بند چودہ : شاعر کہتا ہے کہ اچانک شور شرابے کے ساتھ ہی کفّار کی فوج کا ایک دستہ کربلا والوں کے سامنے آیا اور اتنے زیادہ تعداد میں فوج آئی کہ جس طرح سیاہ گھٹا چھا جائے تو آسمان پر چمکتے تارے نہ دکھائی دیں۔ تیرہ گھٹا اور تاروں میں صفت کنایہ ہے ۔سیاہ گھٹا ،فوج مخالف کے سیاہ کارناموں والے مراد ہیں اور تارے جو اپنی چمک سے تاریکی کو دور کرتے رہتے ہیں رسول خدا کے نواسے اور ان کے ساتھی ہیں۔

اس طرح سے وہ سیاہ کارنامے والوں کی سیاہ فوج ،خورشید، کی طرح روشن دل، روشن ضمیر، روشن صفت حسین کو دبانے کے لیے آ گئی اور آتے ہی اپنے سیاہ کارنامے شروع کر دیے کہ تین دن کے پیاسوں کو تیر کا نشانہ بنانا شروع کر دیا تو مسکراتے ہوئے جناب امام حسین نے منھ اپنے بھائی عباس دیکھا۔عباس حسین کی فوج کے سپہ سالار ہیں، کہ اب وقت جنگ آ گیا ہے بھائی عباس (شاہ شہدا یعنی شہیدوں کے شاہ یعنی امام حسین)اور سارے دوستوں نے امام حسین کا منھ حسرت سے دیکھا کہ مولا اب سوائے جنگ کے اور کوئی صورت نہیں ہے۔

بند پندرہ : اس پر جناب عباس نے امام حسین کو بتایا کہ آپ کے سارے لوگوں میں بہادروں کا سا جوش ہے بھوک اور پیاس کا کوئی اثر ان پر نہیں ہے۔اُدھر سے تیر آ رہے اور ہم سب تیر کھا رہے۔اب تلوار سے وار کرنے کا وقت ہے اس لیے کہ فوج مخالف کو اب کسی طرح کا کوئی لحاظ نہیں۔ یہاں تک کہ مہمانوں کے ساتھ جو بنیادی انسانی رویہ برتا جاتا ہے اس سے بھی یہ ستم گار بے حیائی برت کر تیروں کی بوچھار ہم پر کر رہے ہیں۔اس لیے اب آپ ہمیں جنگ کی اجازت دیجئے ورنہ یہ ذلیل لوگ ہمارے خیموں تک آ جائیں گے۔ ہماری خاموشی کو یہ لوگ ہماری کمزوری تصور کرتے ہوئے بڑھتے چلے آتے ہیں۔

بند سولہ : امام حسین نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ بھائی نہ ہم لڑائی چاہتے ہیں اور نہ بہادری دکھانا چاہتے ہیں۔ یہ دشمن دیں میرے خون کے پیاسے ہیں مجھے نانا کے دین کو بچانے کے لیے خود اپنی شہادت دینا منظور ہے اس لیے ہم کو ان سے جنگ منظور نہ تھی مگر ان کی ذلیل حرکتوں سے مجبور ہو کر اب جنگ بھی کرنا پڑے گا تو لڑ لو، اس لیے کہ یہ ظالم بلا جرم وقصور کے ہم پر چڑھے چلے آتے ہیں اور میرا سر کاٹنے کے لیے ایک جم غفیر لشکر سے یہ ناری یعنی جہنمی چلے آ رہے ہیں۔اس لیے ان سے مقابلہ کر لو ورنہ میرے سر دینے کا وقت آ جائے گا۔

بند سترہ : جناب امام حسین کی اجازت جنگ پاتے ہی حسینی فوج کے شیروں نے اپنے اپنے گھوڑے میدان میں اتار دیئے اور ایک کے بعد، میدان جنگ میں مثل شہباز گیا اور جنگ کے ایسے حربے دکھائے ،ایسی جانبازی سے لڑے کہ دشمن کا ہر وہ فوجی جو بڑی شان سے آگے بڑھا، اس کے ہاتھ کاٹ دیئے۔ یہی نہیں تلوار کی تیزی نے دشمن کے سر و تن میں جدائی بھی کر دی اور ایک ہی حملے میں حسینی فوج کے بہادروں نے دشمن کی فوج کے قدم اکھاڑ دئے۔

بند اٹھارہ : حسینی فوج کے جوان جس پر بھی غصے میں گئے تو ایسا گئے جیسے اپنے شکار پر شہباز گرتا ہے کہ دشمن کے کسی فوجی کی کمان گری تو کوئی وہ نیزہ انداز گرا جس کا تیر نشانہ سے کبھی خطا نہیں کرتا تھا اور ایک سے ایک نامی بہادر گھوڑے سے گرنے لگے اور ایک

سے ایک تفرقہ پرداز گرا کہ ہاتھ منھ کٹ گیا ہمت ہار گیا سارے مورچے اور پرے سب دھرے کے دھرے رہ گئے۔

جی چھوٹ۔ معنی ہمت ہار گئے

مورچے۔ جنگ کے واسطے جو خندق اور گڑھے بنائے جاتے ہیں۔

پرے ٹوٹ گئے۔ یعنی الگ الگ ہو گئے۔

بند اُنیس : شاعر کہتا ہے کہ جنگ کا یہی سلسلہ صبح سے ظہر کے وقت چلتا رہا کہ حسینی جوان دشمن کی فوج میں لاش پر لاش گراتے رہے اور میدان جنگ لاشوں سے بھر گیا۔ ساری جنگ کے واسطے بنائیں گئی صفیں بگڑ گئیں اور پرے سب ٹوٹ گئے، اپنی بہادری اور کارنامے پر حضرت علی کے فرزند سرخ رو یعنی کامیاب و کامران دنیا سے اٹھے کہ دین کو بچانے کے لیے جو نانا سے عہد تھا اس کو پورا کرنے کا کارنامہ انجام دے لیا۔ کسی فوج میں ایسے لاشے کے لاشے گرنا کم ہی ہوتا ہے جیسا کہ امام حسین کے جوانوں نے آج دشمن کی فوج میں لاشوں کے ڈھیر لگا کر دکھا دیا اور اس بہادری سے یہ جانباز لڑے کہ سب یہ کہتے تھے کہ یہ تو شاید مولا علی ہی جنگ کر رہے ہیں۔

مشکل الفاظ کے معنی:

تا وقت زوال	ظہر کے وقت تک
میدان قتال	میدان جنگ
سرخ رو	کامیاب و کامران
اسد اللہ	حضرت علی کا لقب تھا
کھیت پڑنا	محاورہ ہے یعنی تباہی آنا

بند بیس : جنگ کا یہ سلسلہ حسینی جانباز دوپہر تک دکھاتے رہے۔ اس کے بعد حسینی چمن کو خزاں کے ہوا نے لوٹ لیا یعنی دشمنوں نے بھاری حملہ کر کے امام حسین کے ستر بہتر ساتھیوں کو مار دیا۔ اس کو شاعر نے محاورے میں لکھا ہے کہ امام حسین کے چمن کا پتّا پتّا بوٹا بوٹا تباہ و برباد ہو گیا۔ باپ، بیٹا، بھتیجا، بھائی، دوست، سب مارے گئے اور جاتے رہے۔ اس سانحہ عظیم سے امام حسین جیسے بہادر اور جری کی کمر ٹوٹ گئی بازو ٹوٹ گیا یعنی بیٹا مارا گیا، بھائی جسے دست و بازو کہا جاتا ہے مارا گیا اور کوئی نہ دوست نہ مددگار رہ گیا۔ ظہر کے وقت تک صرف حسین ابن علی تنہا رہ گئے۔

بند اکیس : ایسے وقت میں فوج مخالف کے ظالم یہ چلا رہے تھے کہ حسین آپ خود جنگ کو آئیں اور اپنی بہادری کے جوہر دکھائیں۔ جوہر تیغ شہنشاہ نجف۔ معنی حضرت علی کی بہادری کے جوہر آپ خود دکھائیں اور اب یہی تمنا ہے کہ حسین آپ کا بھی سر تن سے کاٹ لیں تو اپنا کام ہو جائے اور پسر سعد سے جو وعدہ انعام لینے کا ہے وہ حاصل کر لیں۔ آپ کی شہادت کے بعد پسر سعد کے اس حکم کی بھی تعمیل ہو جائے کہ آپ کی گھر کے بچوں اور عورتوں کے خیموں کو جلا دیں۔

پسر سعد : سعد کا بیٹا۔ عمر ابن سعد جو یزیدی فوج کا سپہ سالار تھا۔

بند بائیس : اس بند میں امام حسین فوج مخالف سے مخاطب ہوکر کہتے ہیں کہ تم میرا سر کاٹنے آئے ہولو میں حاضر ہوں۔تم کو اجازت دیتا ہوں تم میرا سر کاٹ لو، میں تو نانا کے دین کو بچانے کے لیے اپنا سر دینے ہی آیا ہوں۔ میں لڑنے میں بھی قاصر نہیں ہوں اور مرنے بھی قاصر نہیں ہوں۔ میرے پاس اب کوئی فوج نہیں ہے نہ کوئی مدد کرنے والا ہے۔ اب اس میں تمہارا فیصلہ شہر اور جنگل سب پر ہے میں تو تھوڑی دیر کا مسافر ہوں۔ راہ خدا میں جان دینا میرا فریضہ ہے ادا کر رہا ہوں تم جو چاہے کرلو، پھونکو، تباہ برباد کرو، تم اپنے کو کلمہ گو کہتے ہو۔ یہ تمہارے نبی ہی کا گھر ہے جس کا تم کلمہ پڑھتے ہو۔

بند تئیس : آگے کہتے ہیں کہ یہ خیمے ہیں اس میں کئی سیدانیاں ہیں جن کے مرتبے سے اس دنیا و جہاں میں سب واقف ہیں۔ اب ان کے سر پر نہ کوئی وارث ہے اور نہ کوئی مالک ہے۔ تم سارے خیمے لوٹ لو، آگ لگا دو، مگر رسول زادیاں ہیں ان کے لیے کوئی ایک خیمہ دے دو، جہاں یہ پردہ میں بیٹھ کر سب اپنے والی و وارث پر رو سکیں۔

بند چوبیس : امام حسین کی ان باتوں کو سن کر اعدا نے جواب دیا۔ شاعر کہتا ہے کہ اگر میں اس کو لکھ دوں تو پتھر کا دل پانی پانی ہو جائے۔ امام حسین نے کس صبر وضبط سے اس کو برداشت کیا صرف آسمان کی طرف دیکھا امام حسین خاموش رہ گئے۔ اشارہ ہے کہ اللہ کی طرف دیکھ، دل ہی دل میں یہ آواز دی کہ ربّ العزت تیرے رسول کے دین کو بچانے کی خاطر یہ ساری مصیبتیں برادشت کر رہا ہوں اور اسی صورت میں آنکھوں آنسو آ گئے تو شاعر کہتا ہے کہ جب کسی کا دل بھر آتا ہے تو آنسوؤں سے اسے ٹھنڈا کیا جاتا ہے۔ خاموشی سے دشمنوں کے سامنے ہٹ کر اپنے خیمے کی طرف آ گئے۔

بند پچیس : ذرا تھم کر، آواز دی کہ اے بہن زینب و بہن ام کلثوم تمھارا بھائی حسین تم سے دم آخر رخصت کے لیے آیا ہے۔ اس لیے کہ یہ ظالموں کا پورا لشکر اب مجھے قتل کرنے پر اتارو ہے۔ میں جاتا ہوں بہن میری معصوم بیٹی سکینہ کو بھی جگا دو اس سے بھی مل لوں۔ اس لیے کہ وہ جو دنیا سے گزر جاتا ہے پھر نہیں ملتا اور میرے فرزند عابد بیمار کو بھی اٹھا دو۔ کہہ دو کہ تمھارا باپ دم آخر تم سے ملنے آیا ہے۔

زینب وام کلثوم : امام حسین کی بہن

سکینہ : امام حسین کی چار سال کی بچی

عابد : امام حسین کے بڑے فرزند جو بیماری کے سبب جنگ کرنے سے رہ جاتے ہیں ان کو عابد بیمار کہا جاتا ہے۔

اس کے بعد ۲۵، ۲۶، ۲۷، ۲۸، ۲۹ نمبر کے بند میں روایتی طرح کی عام گفتگو ہے معنی بھی بہت واضح ہیں اس لیے ان کی تشریح طلباء اپنے آپ کرلیں۔

بند تیس : مرثیہ کے جُز۔ رجز کا بند ہے جس میں حسینی فوج کا ہر جانباز میدان جنگ میں پہنچ کر اعداد کو فخریہ اپنے آبا و اجداد کے نام سے واقف کراتا ہے اور اپنی شجاعت و دلیری کا ذکر کرتا ہے۔

زیر نظر بند میں شاعر کہتا ہے کہ میدان جنگ میں پہنچ کر امام حسین نے یہ نعرہ کیا کہ اے فوجِ جفا کار سن لے، تیرے سامنے جو

مجاہد آیا ہوا ہے وہ تمھارے رسول، جس کا کلمہ پڑھنے کے تم دعوادار ہو اس کا نواسہ ہے یعنی میں رسول خدا کی بیٹی فاطمہ کا فرزند ہوں۔ مجھ کو دیکھ کر، پہچان لو۔ میں راہ راست پر چلنے والا ہوں۔ میں رسول خدا کے دین کو بچانے کی خاطر آیا ہوں۔ اس کے لیے جان کی بازی لگانا میرا فرض ہے۔ نہ میں زخمی ہونے سے اور نہ مرنے سے ڈرتا ہوں، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ تین دن کا بھوکا پیاسا ہوں اور چین و آرام سب بھول چکا ہوں۔ مجھے کسی بات کا شکوہ و شکایت نہیں انتہائی صبر و شکر کے ساتھ مرضی الٰہی پر رضا مند ہوں۔

بند اکتیس : میں انیس کہتے ہیں کہ امام حسین بڑے فخر سے یہ اعلان کرتے ہیں۔ میں ساقی کوثر یعنی حضرت کا پیارا فرزند ہوں۔ میرے والد فاتح خیبر و بدر ہیں (جنگ خیبر اور جنگ بدر رسول خدا کی دو بڑی اہم جنگیں تھیں جن کو حضرت علی نے بڑی بہادری سے سر کیا تھا) امام حسین یہاں پر اس کی طرف اشارہ کر رہے ہیں اور اپنے فخر و مباحات میں اضافے کے لیے یہ بھی جتا رہے ہیں حضرت علی کی ان ہی صفات کو دیکھ کر خدا کے رسول محمد صاحب نے اپنی دختر جناب فاطمہ زہرا سے ان کی شادی کی تھی۔ علی کی شان یہ ہے کہ ان کو رسول کا تخت ملا رسول کے فوج کی سرداری ملی دین کی سربراہی ملی اور انھیں رسول کے دوش بدوش دین کی تبلیغ کے مرتبے کی بلندی حاصل ہوئی۔

بند بتیس : شاعر کہتا ہے کہ امام حسین ابھی اپنی تقریر جاری کیے ہوئے تھے کہ فوج مخالف سے تیر آنے شروع ہو گئے تو اپنی تلوار کو چوم کر امام حسین نے بھی تلوار چلانی شروع کی اور یہ اعلان کیا کہ تو خبردار ہو اب اگر تم جنگ پر ہی آمادہ ہو تو لو علی کی تلوار ذوالفقار کی تیزی کو دیکھو کہ میں صفین و حنین کی جنگوں کو فتح کرنے والے کا بیٹا ہوں اور جنگ کے لیے آتا ہوں اور تم سے جتنی صفیں باندھنا بنے بباندھ لو اب حسین رکنے والا نہیں ہے۔

بند چونتیس : یہ بند مرثیہ کے جز جنگ کا ہے۔ اس جز میں حسینی فوج کے جانبازوں کا میدان جنگ میں بہادری کے ساتھ جنگ کرنے کے حالات پیش کیے جاتے ہیں۔ زیر نظر بند میں شاعر امام حسین کی جنگ کا منظر پیش کر رہا ہے کہ کس طرح سے امام حسین کی دودھاری تلوار ذوالفقار میدان میں چمکی۔ یہ تلوار وہ تھی جو حضرت علی کو جنگ بدر میں خدا کی طرف سے عطا ہوئی تھی۔ وہی تلوار امام حسین یہاں میدان کربلا میں لے کر آئے ہیں اور دشمن کو لاکھ سمجھانے پر جنگ کے لیے آمادہ اور اوتاولے پانے پر امام حسین نے اپنی تلوار چلانی شروع کی تو دشمنوں کی فوج سے ہزاروں ڈھال والے ڈھال سنبھالے سامنے دکھائی دیئے لیکن امام حسین کی تلوار بجلی سے بھی زیادہ تیز رفتار میں چمکتی دکھائی دی اور ایک بار جب چمک گئی تو بجلی کیا مقابلہ کرے گی اس لیے کہ بجلی کبھی چمکتی ہے کبھی چھپتی ہے لیکن یہ تلوار اب صرف چمکنے کا کام کر رہی ہے اور ہر جانب کبھی اوپر، کبھی نیچے، کبھی دشمنوں کی بھیڑ میں کبھی ان کی بھیڑ سے باہر ہر طرف چمک رہی ہے۔ وہ تلوار ناگن کی طرح سے دشمنوں کو ڈستی جا رہی ہے اور ایسا لگتا ہے کہ کٹے ہوسروں کی برسات ہو رہی ہے۔

بند پینتیس : اس بند میں شاعر تلوار کے چلنے ہی کی کیفیت بیان کر رہا ہے کہ امام حسین کی چلتی ہوئی تلوار کبھی کسی کا چہرہ کاٹ رہی ہے تو کبھی بازو کبھی جسم، کبھی کسی کا گلا، اور کسی کا سر، جو دشمن کی فوج کا سپاہی جس طرح بھی نشانے پر آیا صفایا کیا۔ یہی نہیں بلکہ ان کی تلوار دشمن کے فوجیوں کے جنگی اصلحہ چاہے وہ مغفر ہو یعنی لوہے کا خود جو حفاظت کے لیے سر پر رکھا جاتا ہے۔ چاہے جوشن یعنی لڑائی میں جسم پر پہننے کی زرہ اور چاہے بکتر یہ بھی ایک جنگی جامہ ہے سب کو تلوار کاٹتی چلی گئی اور لمبائی سے کاٹنے میں گھوڑ سوار اور گھوڑے

دونوں کو دو حصوں میں برابر کاٹ کر رکھ دیا کہ تلوار کی تیزی کا شور، قاف تا قاف یعنی تمام دنیا میں پھیل گیا اور تلوار کی چمک ایسی رہی کہ ہزاروں کا خون کیا مگر اس کا منھ صاف ہی رہا کہیں کوئی داغ نہ رہا۔

بند چھتیس : اس بند میں شاعر اسی بات تو الٹ کر کہہ رہا ہے۔ پہلے بند میں تلوار کے چلنے کا منظر دکھا رہا ہے۔ زیر نظر بند میں شاعر کہہ رہا ہے کہ دشمن کی فوج کا کوئی حربہ تلوار کو نہ روک سکا۔ نہ خود، اور نہ سر روک سکا، اور نہ کسی کی تلوار امام حسین کو روک سکی اور تلوار اتنی تیز چل رہی تھی کہ دشمن کا سر ماتھا، گلہ، جگر جب چیرتی ہوئی گھوڑے کی زین اور گھوڑے کی کمر کو بھی کاٹ کر آگے بڑھ گئی کہ ساری فوج میں شور مچ گیا کہ اب میدان چھوڑ کر بھاگو یہ وقت اور موقع میدان میں ٹھہرنے کا نہیں۔ علی کے لعل کو غیض آ گیا ہے، اب اس تلوار کا زہر اترنے والا نہیں ہے۔

اور اب اس کے آگے کے ۳۷، ۳۸، ۳۹ ویں بند میں امام حسین کی جنگ کا ہی منظر ہے جو بہ آسانی سمجھا جا سکتا ہے۔

بند چالیس : میں شاعر اپنے انداز بیان میں ایک گریز پیدا کرتا ہے اور کہتا ہے کہ امام حسین کی بہادری کی لڑائی دیکھ کر آسمانی آواز آئی کہ اے علی کے لعل تیری بہادری اور جانبازی کا مظاہرہ ہو چکا تو اس منصب میں بھی آسمان مقام ہے۔ یہ جنگ جو تم نے دکھائی ہے تین دن کی بھوک اور پیاس میں کسی انسان کے بس کی بات نہیں۔ اے محمد کے دل کے ٹکڑے، علی کے فرزند، تم خود امام وقت ہو اور لوح محفوظ میں یعنی آسمانی تختی پہ مرقوم ہے یعنی لکھا ہے تو تم بہت بڑے صبر کرنے والوں میں ہو۔ اس لیے امام حسین تم اپنی تلوار کو نیام میں رکھ لو۔ ان ظالم و فاجر دشمنوں سے جنگ کرنے کے لیے آگے خدا کا حکم نہیں ہے۔ اب امام حسین تم نے اپنے نانا سے وعدہ کر رکھا ہے کہ دین کی بقا کے لیے سر دو گے تو امام حسین اس وعدے کو پورا کرنے کا وقت آ گیا ہے۔ اس لیے تم اپنی تلوار کو روک لو اور سر دینے پر آمادہ ہو جاؤ۔

بند اکتا؛لیس : یہ آواز سن کر امام حسین تلوار چلانے سے تھم گئے اور روک کر بارگاہ خدا میں فرمایا کہ یہ سر حاضر ہے، کاٹ لیا جائے۔ میرے لیے یہ عہد کا موقع ہوگا کہ اپنا طفلی کا وعدہ پورا کر دیا۔ اے شمر ظالموں کے ظالم آؤ۔ یہ عاشق رسول فدا ہونے کو تیار ہے۔ میری بڑی جیت یہی ہے کہ رب العزت میری قربانی لینے کو تیار ہے۔

اس بند کے بعد ۴۲، ۴۳، اور ۴۴ بھی اسی معنی و مفہوم کے ہیں آسان اور سادہ ہیں۔

بند پینتالیس : مرثیہ کے جز۔ شہادت سے تعلق رکھتا ہے۔ اس میں حسینی فوج کے جانباز بہادر کا میدان جنگ میں زخمی ہو کر شہید ہونے کا منظر بیان کیا جاتا ہے۔ چنانچہ زیر نظر بند میں میر انیس کہتے ہیں کہ امام حسین لڑتے لڑتے جب اس پوزیشن کو پہنچے کہ گھوڑے پر اب نہیں ٹھہر سکتے تو امام حسین جو عرش خدا کا تارا ہیں وہ گھوڑے سے خاک پر آ جاتے ہیں اور گرتے ہی بے ہوش ہو جاتے ہیں۔ تھوڑی دیر بعد جب تک ہوش میں آئیں دشمن کے فوج کے سردار ابن انس نے بڑھ کر ایک بھالا سینے میں بھونک دیا کہ اس کی نوک امام حسین کے پیٹھ کے باہر تک نکل گئی یہ منظر دیکھ کر امام حسین کی بہن رسول خدا کی نواسی زینب کرب والم کے عالم میں ننگے سر تڑپتی ہوئی خیمے سے باہر آ گئیں۔

بند چھیالیس : یہ بند مرثیہ کے جز بین سے تعلق رکھتا ہے۔ جس میں عزیز، احباب، وانصار، شہادت پر اظہار غم والم رو رو کر

کرتے ہیں۔زیرنظر بند میں شاعر کہتا ہے کہ بھائی حسین کی شہادت کو دیکھ کر بہن زینب اپنا منھ اپنے ہاتھوں سے ڈھانپ کر چلا چلا کر رونا شروع کیا اور کہتی گئیں کہ اے ظالموں تم میرے بھائی کو میرے سامنے ذبح کرتے ہو اور جیسے ہی امام حسین کو پہلی ضرب لگی یہاں زینب غش کھا کر زمین پر گر گئیں۔تھوڑی دیر بعد جب اٹھیں اور جانب مقتل دیکھا تو امام حسین کا سر تن سے جدا کر کے دشمن نوک نیزہ پر لے جا رہے تھے۔

بنداڑتالیس : اور اس کے بعد نصاب میں داخل آخری بند مرثیہ بھی آخری بند ہے۔مگر انیس کا یہ مرثیہ ۱۰۱ بند کا ہے۔اپنا نصاب تو انتخاب ہے۔انیس نے پورا مرثیہ ۱۰۱ بند میں مکمل کیا ہے۔

یہ آخری بند مرثیہ کے آخری جز دعا کا ہے۔جس میں شاعر تمام حاضرین کے لیے اور اپنے لئے دعا کا طلب گار ہوتا ہے۔

زیرنظر بند میں شاعر کہتا ہے کہ بس انیس بس۔اب آگے نہ بیان کرو۔اس بے حال زینب کے بین،جس کی نظروں کے سامنے اس کے بھرے پُرے خاندان کا یہ آخری سہارا ابھی ذبح ہو رہا ہو اور اس طرح سے کہ سر حسین کاٹ کر لاش حسین کو دھوپ میں یوں ہی چھوڑ دیا جائے جس کے لاشے کو نہ کفن ملا ہو نہ قبر ملی ہو۔بعد شہادت امام حسین خیام حسینی جلائے گئے ہوں اور آل رسول کو رسن بستہ کیا گیا ہو۔امام حسین کو تنہا نہیں برباد کیا دشمنوں نے بلکہ آل رسول کو ایسا برباد کیا کہ پھر وہ آباد نہ ہو سکے۔خدا ان پر تو اپنی رحمت خاص نازل کر۔

میر انیس کا یہ مرثیہ اجزائے مرثیہ کے اعتبار سے ایک مکمل مرثیہ ہے جس میں سارے اجزا موجود ہیں۔شاعرانہ خوبیوں کا بھی مظہر ہے۔یہ ان کے چند مشہور مرثیوں میں ایک ہے۔

❑❑❑

اکائی ۹: مرزا دبیر کی مختصر سوانح اور فن پر تبصرہ (دست خدا کا قوتِ بازو حسین ہے کا تنقیدی تجزیہ)

مرزا دبیر کی مختصر سوانح عمری

مرزا سلامت علی نام 'دبیر تخلص' مرزا غلام حسین کے بیٹے تھے۔ ۲۹ راگست ۱۹۰۳ء کو دہلی کے محلّہ بلی ماراں میں پیدا ہوئے۔ مگر بچپن میں ہی والد کے ساتھ لکھنؤ چلے آئے اور پھر یہیں کے ہو رہے۔ یہیں علمی استعداد حاصل کی اور اپنے دور کے عالموں میں شمار ہوئے۔ شاعری میں اپنے وقت کے بلند پایہ مرثیہ گو میر مظفر حسین ضمیر کے شاگرد ہوئے۔ اپنی عالمانہ مہارت اور شاعرانہ کمال سے اپنے استاد سے زیادہ شہرت حاصل کی اور مرثیہ نگاری میں میر انیس کو چھوڑ کر اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ اردو زبان میں سب سے زیادہ مرثیے دبیر نے لکھے۔ ۱۸۷۵ء میں لکھنؤ میں وفات پائی اور اپنے گھر ہی میں دفن ہوئے۔

مرزا دبیر کے کلام کی نمایاں خصوصیات

مرزا دبیر اپنے زمانہ کے بہت بلند شاعر تھے۔ اردو مرثیہ میں انیس کے علاوہ کوئی ان کا مرد مقابل نہیں ہے۔ وہ اپنے وقت کے لکھنوی ماحول، مزاج اور مذاق کے مقبول ترین تصورات کے ترجمان ہیں۔ جہاں شاعری کا جوہر صناعی مانا جاتا تھا۔ صناعی میں بیان کی وہ خوبیاں ہوتی ہیں جنہیں تشبیہ، استعارہ، مجاز، کنایہ، کہتے ہیں۔ ان خوبیوں سے دبیر کا کلام بھرا پُرا ہے۔ صنعت کی خوبیوں میں ایک خوبی صنعت مہملہ ہے یعنی بغیر نقطہ کے الفاظ سے شعر کہنا ایسے اشعار دبیر نے ۵۵۷ کہے ہیں جو اردو کے کسی شاعر کے یہاں نہیں ہے۔

ملاحظہ ہو:

مہر علم سرور اکرم ہوا طالع　　مہر ماہ مراد دل عالم ہوا طالع

اس صنعت میں دبیر نے دو مکمل مرثیے کہے ہیں اور کئی قطعات بھی۔ صناعی بلا شبہ ایک تخلیقی ہنر ہے اور دبیر اس کے استاد ہیں۔ اردو مرثیہ نگاری میں مرزا دبیر کا نام مرثیہ کو عظمت سے ہم کنار کرانے میں انیس کے ساتھ ساتھ رہے گا۔ دبیر کے مرثیوں میں واقعہ نگاری اور جذبات نگاری کے ایسے نمونے ہیں کہ انیس کے علاوہ کسی اردو مرثیہ نگار کے یہاں نایاب ہیں۔

واقعہ نگاری کا موقع ملاحظہ ہو۔ کتنا دل دوز ہے۔ امام حسین عازم سفر ہیں گھر کے سب لوگ ساتھ جا رہے ہیں۔ ان کی چھوٹی بیٹی بیماری کے سبب مدینے میں ہی رہ جاتی ہے۔ بیٹی کہتی ہے ؎

دامن پکڑ کے کہتی ہے بابا کب آؤ گے　　لے جاؤ گے ہمیں کہ یہیں چھوڑ جاؤ گے
بیمار کی خبر بھی کسی سے منگاؤ گے　　یا پیار میں سکینہ کے ہم کو بھولاؤ گے
لینے کو میرے بھجو گے کس کو مدینے سے
یا نا امید ہی میں رہوں اپنے جینے سے

واقعہ نگاری کے ضمن میں واقعات کی سچی تصویر پیش کر دینا مرزا دبیر کا بے مثال کارنامہ ہے۔اسی طرح جذبات نگاری میں اکثر جگہوں میں وہ میر انیس سے بھی آگے دکھائی دیتے ہیں:

علی اصغر چھ ماہ کے بچے کی پیاس کو دیکھ کر، بچے کی ماں کے جذبات ملاحظہ ہوں:

بانو کے شیر خوار کو ہفتم سے پیاس ہے　　بچے کی نبض دیکھ کے ماں بے حواس ہے
نَے دودھ ہے، نہ پانی کے ملنے کی آس ہے　　پھرتی ہے آس پاس کہ جینے سے یاس ہے
کہتی ہے کیا کروں میں دہائی حسین کی
پتلی پھری ہے آج میرے نور عین کی

بے چین و بے قرار ماں کے جذبات کا کیسا بھرپور نقشہ ہے۔

مرزا دبیر کی شاعری اپنی پوری توانائی کے ساتھ اردو رثائی ادب میں جلوہ گر ہے اور اردو مرثئے کے سر بلندی اور تابندگی کی ضامن ہے۔انھوں نے اپنی شاعری سے اردو شعر و ادب کو اسلوب اور اظہار میں بڑی بلندی عطا کی ہے اور اردو مرثیہ کو بڑا وقار بخشا ہے ۔اردو میں سب سے زیادہ مرثیے لکھے اور اردو شاعروں میں سب سے زیادہ شعر کہے، یہ ان کا ایک وصف ہے ۔ان کے مراثی ہندوستان سے باہر عرب، ایران، کابل اور عراق تک پڑھے جاتے ہیں۔رجب علی بیگ سرور اور غالب نے ان کی شاعرانہ بلندیوں کو تسلیم کیا ہے۔

❑❑❑

4.2 انتخابِ متن

متن مرثیہ (انتخاب)

دستِ خدا کا قوت بازو حسین ہے　　بے شک، حسن کا زینتِ پہلو حسین ہے
خیر الورا کا یوسفِ خوش رو، حسین ہے　　باغِ جناں کے پھول کی خوشبو، حسین ہے
ایمان اس کی جان، یہ ایماں کی جان ہے
قرآں دہن ہے، اور یہ گویا زبان ہے
ایمان کی سند ہے، محبت حسین کی　　مثلِ نماز فرض ہے، طاعت حسین کی
ہفتاد حج ہیں ایک زیارت حسین کی　　واجب ہے کائنات پہ بیعت حسین کی
دنیا و دیں کا، بیعتِ مولا سے چین ہے
ایمان، زیر دست جنابِ حسین ہے

لکھا ہے، بے وطن جو امام امم ہوئے کچھ دن حرم کو لے کے مقیم حرم ہوئے
کعبے میں آ کے اور حرم محترم ہوئے گویا کہ اہل بیت خدا سب حرم ہوئے
پر، خانۂ خدا میں بھی کوفی ستاتے تھے
پیکِ اجل، خطوط اجل روز لاتے تھے

عباس کے پسر کی زبانی ہے یہ رقم مہمان تھے حرم میں ابھی شاہ محترم
اک روز اپنی آنکھ سے کیا دیکھتے ہیں ہم در پر کھڑا ہے کعبے کے وہ قبلۂ حرم
پابوس، آستانِ حرم، شاہ دیں کا ہے
اور ہاتھ شہ کے ہاتھ میں روح الامیں کا ہے

چشم ادب سے مل کے کف شاہ مشرقین جبریل دے رہے ہیں ندا یوں بہ شور و شین
اے امت نبی! یہ نبی کا ہے نور عین بیعت خدا کی ہے، بہ خدا بیعتِ حسین
جو آرزوئے بیعتِ دستِ خدا کرے
آئے وہ بیعتِ خلفِ مرتضا کرے

کب اس زمیں نے پائے تھے، یہ لعل یہ گہر یہ پھول یہ ستارے، یہ خورشید، یہ قمر
آئے سب اہلِ قریہ زیارت کو یک دگر نکلیں گھروں سے بیبیاں، برقع سنبھال کر
بولا کوئی، کہ نام خدا کیا سپاہ ہے
اک نے کہا کہ واہ! عجب بادشاہ ہے

مولا کے اک رفیق نے بڑھ کر یہ دی ندا تم کلمہ کس کا پڑھتے ہو، بولے رسول کا
اس نے کہا، یہ ان کا نواسا ہے لاڈلا بے رحمی یذیر سے ترکِ وطن کیا
جاری تمہاری بستیوں میں یہ جو نہر ہے
یہ نہر، اس غریب کی مادر کا مہر ہے

آوازِ دورباش کا ناگاہ غُل اٹھا اور خیمے میں اترنے لگی آل مصطفیٰ
ڈیوڑھی سے پر، کجاوۂ زینب جوں ہی لگا خود اہتمام کرنے لگے شاہ کربلا
روکی قنات اکبر و قاسم نے آن کر
عباس گرد پھرنے لگے نیزہ تان کر

عفت کے جتنے مرتبے خیرالنسا نے پائے وہ ماں کے بعد دختر مشکل کشا نے پائے
ہاں ہاں مسافرو! نہ کوئی غل مچانے پائے ناقے پہ بیٹھ کر، نہ ادھر کوئی آنے پائے
حسنِ ادب یہی ہے، کہ حق کو پسند ہو

وہ بیٹھ جائے جس کا کہ قامت بلند ہو

مسند پہ یاں بٹھا کے بہن کو شہ ہدا کرسی پہ آکے بیٹھے، قریب حرم سرا
تھے دست بستہ گرد جوانانِ مہ لقا لے لے کے نذریں آئے زمیں دار کربلا
استادہ فرط خلق سے شبیر ہو گئے
نذروں پہ ہاتھ رکھ کے بغل گیر ہو گئے

بٹھلا کے پہلوؤں میں انھیں یوں کیا بیاں اے کربلائیو! میں تمہارا ہوں میہماں
ظالم مجھے ستاتے ہیں، جاتا ہوں میں جہاں بیچو جو یہ زمین، تو چندے رہوں یہاں
اب خاک تم عزیز کرو اس غریب کی
سید کی، بے وطن کی، مصیبت نصیب کی

سب نے کہا کہ عذر ہمیں کیا ہے یا امام حاضر غریب خانہ ہے واں کیجئے قیام
پر کربلا کی بیع میں ہے خوف لا کلام آزار پاتے آئے ہیں یاں انبیا تمام
ابن ابو تراب سے پیاری زمیں نہیں
پر یہ زمین لائقِ سلطانِ دیں نہیں

دینار دے کے ساٹھ ہزار ان کو یہ کہا میں نے تمہیں یہ بخشے، زمیں تم کرو ہبا
شبیر کے معاملے پر سب نے رو دیا لکھنے لگے قبالہ زمیں دار کربلا
غُل پڑ گیا حسین وطن کو نہ جائیں گے
لو مول لی زمیں، یہیں بستی بسائیں گے

واں تو کلید مہر سے قفلِ سحر کھلا یاں اہلِ روئے بیت پہ ماتم کا در کھلا
اشک رواں کا تار بندھا اور سر کھلا قرنا ہوئی، نشانِ سپاہِ عمر کھلا
دربار حق میں خیمے سے شاہ زمن چلے
سر لے کے نذر ہاتھ میں ستر دو تن چلے

فوجِ ستم بڑھی کہ خزاں کی ہوا چلی گلزار اہلِ بیت کی توڑی کلی کلی
چلائی بال کھول کے زہرا کی لاڈلی فریاد یا رسولِ خدا! داد یا علی!
باغِ رسول، باغِ علی، باغِ فاطمہ
ایسا لٹا کہ ہو گیا تا عصر خاتمہ

کوفے سے ایک ناقہ سوار آیا ناگہاں اک خط عمر کو دے کے، یہ اس نے کیا بیاں
ابن زیاد نے یہ کہا ہے کہ اے جواں سید کے سر کا کب سے ہوں میں منتظر یہاں

سر کاٹنے میں آج نا تاخیر کیجیو
دم لینے کی حسین کو مہلت نہ دیجیو

یہ سن کے چار لاکھ نے مل کر یُرش کیا چاروں طرف سے برچھیوں میں آہ! لے لیا
قرآں کو رحلِ زیں سے زمیں پر گرا دیا نوحہ کیا زمیں نے کہ فریاد کبریا!

مٹتا ہے آج نام علی و بتول کا
ہوتا ہے قتل، آہ! نواسا رسول کا

جلاد آستین چڑھاتا ہوا چلا خنجر پہ انگلیوں کو پھراتا ہوا چلا
مجمع کو راس و چپ سے ہٹاتا ہوا چلا ارکانِ عرشِ حق کو ہلاتا ہوا چلا

اب کیا کہوں کہ پاؤں رکھا کس مقام پر
پھٹتا ہے سینہ حالِ شہ تشنہ کام پر

زہرا پکاری، عرشِ الٰہی ہلاؤں گی اے شمر! تجھ پہ آہ کی بجلی گراؤں گی
اس کو نہ مارے گا تو دعا دیتی جاؤں گی محشر میں حُر سے پہلے تجھے بخشواؤں گی

اس نوحے پر بھی عرش کو اس نے ہلا دیا
خنجر کو بوسہ گاہِ نبی سے ملا دیا

زینب نے ہائے بھائی! کہا اور نکل پڑی بانو نے پھینکی سر سے ردا، اور نکل پڑی
کبریٰ پکاری دا اتبا! اور نکل پڑی چلائی فضہ ہائے خدا! اور نکل پڑی

آگے تو بے حواس حرم روتے جاتے تھے
پیچھے پکارتے ہوئے سب بچے آتے تھے

ناگاہ شہ کا لاشۂ بے سر نظر پڑا سرتاج اہلِ بیت زمیں پر نظر پڑا
گویا گلو بریدہ پیمبر نظر پڑا زینب کو عرقِ خوں جو برادر نظر پڑا

رکھ کر کٹے گلے پہ گلا یوں لپٹ گئی
سمجھے یہ اہلِ بیت کہ دنیا الٹ گئی

گہ دل خراش بین تھے، گہ یاس کا بیاں گہ واحسین! کہتی تھی رو رو کے خستہ جاں
لے کر بلائیں لاش کی، کرتی تھی یہ فغاں بھیا! مٹا گئے مرے ماں باپ کا نشاں

زہرا کی جان، روحِ علی، آہ! کیا کیا؟
امت نے کس گنہ پر ترا سر جدا کیا؟

ہے اب تو یہ بہ خیر کہ دنیا میں پھر تم آؤ زینب کی وارثی کرو، اور پردے میں بٹھاؤ
آخر کہاں رہوں میں، ٹھکانا مرا بتاؤ آئی ندا کہ دربدری کے قلق اٹھاؤ
زینب! امیدوار نزولِ بلا رہو
جب تک میں بے کفن رہوں تم بے ردا رہو

اب وقت ہے دعا کا، کہ ہے شدتِ بکا آمیں کہیں دبیرؔ! محبان مرتضا
یا رب! ہیں جتنے شیعۂ سلطانِ لا فتا مقصد بر آئیں سب کے، مع بانی عزا
یا رب! نہ کوئی غم ہو انھیں، جُز غمِ حسین
ان دوستوں کے ہاتھ ہوں اور ماتمِ حسین

اپنی معلومات کی جانچ کیجئے:

۱۔ دبیرؔ کا یہ مرثیہ کس کی شان میں ہے؟
۲۔ 'خیرالنسا' سے کیا مراد ہے؟
۳۔ 'دختر مشکل کشا' کون ہے؟
۴۔ ابن زیاد کون ہے؟
۵۔ دبیرؔ کا پورا نام لکھئے اور کہاں پیدا ہوئے؟

متن کا تجزیہ:

مرزا دبیرؔ: مرثیہ : دست خدا کا قوت بازو حسین ہے

نوٹ : دبیر کا یہ مرثیہ ''دفتر ماتم'' کی جلد VI ششم میں ہے۔

بند ۱ :	مشکل الفاظ	معنی
	دست خدا	حضرت علی کا لقب
	قوت بازو	مراد فرزند۔ بیٹا
	خیرالورا	مراد جناب محمد صاحب رسول خدا
	یوسف	خوش رو؛ :خوبصورت چہرے والے یوسف۔

جناب یوسف بہت خوبصورت تھے حضرت یوسف ایک نبی ہیں

جن کا حسن مشہور ہے۔

باغ جناں　　جنّت کا باغ

زیرنظر بند میں شاعر جناب امام حسین کے بارے میں کہہ رہا ہے کہ امام حسین حضرت علی کے فرزند ہیں اور حسین اپنے کمال حسن کی زینت اور عزت اپنے وجود سے بڑھاتے ہیں۔ یہ حسین رسول خدا کا خوبصورت یوسف جیسا حَسین نواسہ ہے، جس کے لئے رسول نے فرمایا کہ حُسین مجھ سے ہے اور میں حسین سے ہوں، اس لئے حسین کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ وہ جوانان جنت کے سردار، جنت کے پھلوں کی خوشبو حسین ہیں اور چونکہ رسول کا قول ہے کہ حسین مجھ سے ہیں تو اس کا مطلب یہ کہ حسین دین اور ایمان کے برابر ہیں اور ان کے دہن کا مرتبہ قرآن کے برابر ہے۔ یعنی حسین وہی بات کرتے ہیں جو قرآن کے مطابق ہے۔ اس لیے آپ کو قرآن ناطق کہا جاتا ہے یعنی امام حسین ایک بولتا ہوا قرآن ہیں۔

بند ۲ :　　مشکل الفاظ　　معنی

ہفتاد حج　　ستر حج

کائنات　　دنیا

بیعت　　فرمابرداری

زیردست　　ہاتھ کے نیچے

زیرنظر بند میں شاعر حضرت اما حسین کی منزلت بیان کر رہا ہے کہ رسول نے فرمایا ہے کہ حسین مجھ سے ہیں اور میں حسین سے ہوں۔ اس لیے جو مجھ سے محبت کرتا ہے اس پر حسین کی محبت واجب ہے۔ اس طرح حسین کی محبت ایمان کی سند ہے اور حسین سے محبت مثل نماز، ہر مسلمان پر فرض ہے۔ حسین کی ایک زیارت، ستر حج کے برابر کا مرتبہ رکھتی ہے اس لیے پوری دنیائے اسلام پر حسین کی محبت واجب ہے۔ اور اگر کوئی دین اور دنیا دونوں کو بنانا چاہتا ہے تو پھر وہ امام حسین کی فرمابرداری میں آئے۔ اسی سے چین اور آرام نصیب ہونا ہے۔ مسلمانوں کو یہ سمجھ لینا چاہئے کہ امام حسین کے زیردست ہی یعنی ہاتھ کے نیچے ہی ایمان ہے۔

زیرنظر شعر میں لفظ بیعت کا استعمال کر کے شاعر ہلکا سا اشارہ اس واقعہ کی طرف دے رہا ہے جہاں یزید نے امام حسین سے بیعت طلب کی تھی اور یہ حکم جاری کر دیا تھا کہ یا حسین کی بیعت لاؤ یا پھر ان کا سر لاؤ جس کے سبب یہ واقعہ کربلا عمل میں آیا۔

بند ۳ :　　مشکل الفاظ　　معنی

امام امم　　اماموں کے امام یعنی حضرت امام حسین

حرم کو لے کے　　فارسی لفظ بمعنی گھر کی عورتیں

مقیم حرم　　کعبہ میں قیام کرنے والے۔ حرم عربی لفظ معنی کعبہ

اہل بیت خدا　　خدا کے گھر والے

کوفی　　کوفے کے رہنے والے جنھوں نے امام حسین کو خطوط بھیج کر بلوایا تھا۔

پھر دشمن ہو گئے۔

پیک	فارسی لفظ بمعنی قاصد، ڈاکیہ
اجل	موت

زیرِ نظر بند میں شاعر کہتا ہے کہ کتابوں میں لکھا ہوا موجود ہے کہ جب امام امم یعنی حضرت امام حسین اپنے تمام اہل خانہ کے ساتھ اپنا گھر، اپنا شہر چھوڑنے پر آمادہ ہوئے کہ یزید جیسے بدکردار شخص کی بیعت نہ کریں گے اور اس کی حکومت سے باہر نکل جائیں گے تو اس ارادہ سے جب مدینہ سے روانہ ہوئے تو کچھ دن کے لیے خانہ کعبہ میں بھی جا کر سب کے ساتھ قیام پذیر ہوئے تھے۔ شاعر کہتا ہے کہ اہل بیت اطہار کعبے میں آ کے اور بھی قابل احترام ہو گئے یعنی کعبہ میں قیام کے بعد اہل بیت رسول سب، اہل بیت خدا ہو گئے۔ ان کا مرتبہ اور بلند ہو گیا۔ مگر رسول اور اہل بیت رسول سے دشمنی انھیں یہاں بھی چین اور سکون سے نہیں رہنے دیتے اور خاص کر کوفے کے رہنے والے انھیں خطوط بھیج بھیج کر کہ آپ ہمارے یہاں آ جایئے ہم آپ کی مدد کریں گے جبکہ ایسا بالکل نہیں ہے وہ دھوکا دے کر خطوط بھیج رہے ہیں ان کے یہ خطوط۔ پیک اجل۔ موت کا پیغام ہیں اور وہی ہوا کہ کوفیوں کے بلانے پر امام حسین نے اپنے نانا کے مزار کو چھوڑا اور کوفے کے لیے روانہ ہو گئے تو راستے میں کربلا میں یہ سانحہ عظیم برپا ہوا۔

بند ۴ :	مشکل الفاظ	معنی
	پسر	فرزند بیٹا
	عباس	امام حسین کے چھوٹے بھائی، مثل علی شیر دل، امام حسین کی فوج کے علم بردار یعنی جنرل
	رقم	لکھا
	پابوس	پیر چومنے والا
	آستان حرم	حرم کی ڈیوڑھی پر
	روح الامین:	مقرب فرشتہ، حضرت جبرئیل

اس بند میں شاعر ایک روایت بیان کرتا ہے کہ جو حضرت عباس کے بیٹے کی زبانی بیان کی ہوئی ہے کہ ایک دن جب اہل بیت رسول، خانہ کعبہ میں مہمان تھے تو ہم نے اپنی آنکھ سے یہ دیکھا کہ جناب امام حسین کعبہ کے در پر کھڑے ہیں اور کعبہ کی ڈیوڑھی ان کا پیر چوم رہی ہے اور امام حسین کا ہاتھ حضرت جبرئیل کے ہاتھ میں ہے۔

بند ۵ :	مشکل الفاظ	معنی
	کف	ہتھیلی
	شاہ مشرقین	تمام مشرقی ممالک کے شاہ یعنی امام حسین
	ندا	آواز

نورعین	آنکھ کا نور۔یعنی فرزند، بیٹا
خلف	جانشین۔بیٹا
مرتضٰی	حضرت علی کا لقب تھا

بڑے ادب کے ساتھ جناب حضرت امام حسین کی ہتھیلی کو مل کر حضرت جبرئیل خدا کے مقرب فرشتے یوں آواز دے رہے ہیں بڑے زور وشور سے کہ اپنے کو رسول خدا کی امت کہنے والو یہ جو اس وقت کربلا کے ریگ زار پر تم سے محو گفتگو ہے یہ نبی کا نواسہ حسین ہے۔اگر تم حسین کے ہاتھ پر بیعت کرتے ہو یعنی ان کو اپنا رہنما تسلیم کرتے ہو تو اس کے معنی یہ ہیں کہ تم نے خدا کی بیعت کی ہے۔خدا کو ماننے والے ہو۔اگر سچ مچ تم خدا اور رسول خدا کے ماننے والے ہو اور ان پر ایمان رکھنے والے ہو تو یہی تمہارا امتحان ہے کہ تم لوگ اس وقت امام حسین کی بیعت کرو۔یزید کی بیعت نہ کرو

بند ۶/۱۷ :	مشکل الفاظ	معنی
	لعل	سرخ رنگ کا موتی
	گہر	موتی
	اہل قریہ	گاؤں والے
	زیارت	دیکھنے کو، دیدار کو
	سپاہ	فوج

زیرنظر بند میں شاعر اس وقت کا نقشہ پیش کر رہا ہے جب حسینی قافلہ کربلا کی زمین میں آکر قیام پذیر ہوتا ہے۔ایسے قیمتی اور خوبصورت موتی جیسے جوانان کب کربلا کی اس زمین پر اس سے پہلے آئے تھے۔اس حسینی قافلے میں پھول سے بچے بھی ہیں، ستارے سے چمکتے نوجوان اور خورشید کی طرح روشن جوانان حسین ہیں جن میں اکثر اپنی خوبصورتی میں چاند کے مثل ایسے بے مثال قافلے میں کربلا کے ریگ زار پر رکے دیکھنے کو آس پاس کے گاؤں اور بستی والے آئے اور مرد ہی نہیں ان بستیوں کی عورتیں بھی اپنی اپنی نقابیں اوڑھ کر قافلہ کے ان لوگوں کو دیکھنے آگئیں اور سارے اصحاب، انصار و خاندان والوں کو دیکھ کر سب کے منھ سے یہی نکلتا رہا کہ حسینی سپاہ بے حد قابل تعریف ہے اور یہی نہیں جیسے تمام حضرات باکمال دکھائی دے رہے ہیں ویسے ہی اس فوج کا بادشاہ یعنی امام حسین بھی بے مثل ہیں۔

بند ۷/۱۸ : زیرنظر بند میں شاعر کہتا ہے کہ حسینی قافلہ جب کربلا کے میدان میں ٹھہر گیا اور سامنے سے فوج مخالف بڑھتی چلی آرہی تھی تو امام حسین کے ایک دوست نے یہ آواز بلند کی آگے بڑھ کر یہ کہا کہ اے فوج نابکار تم اپنے کو مسلمان کہتے ہو اور خدا کے رسول کا کلمہ پڑھتے ہو اور یہ تمھارے سامنے کربلا کے میدان میں ٹھہرا ہوا قافلہ اور اس کا سردار حسین کون ہے؟ تمھارے ہی رسول کا نواسہ ہے، جس پر تمھارے فاجر و فاسق بادشاہ یزید نے اپنا ظلم و جبر ڈھایا کہ مجبوراً ان کو اپنے نانا کے وطن کو ترک کرنا پڑا اور یہاں کا راستہ اپنانا پڑا ہے۔اے ظالموں تم کو پتہ ہونا چاہئے کہ یہ جو تمھاری بستی میں علقمہ بہہ رہی ہے یہ نہر اس غریب مسافر یعنی حسین کی مادر گرامی

حضرت فاطمہ زھرا کی نہر ہے جوانھیں مہر میں ملی تھی۔

بند ۸/۱۹ اس بند میں شاعر کہتا ہے کہ کربلا میں جب یہ قافلہ پہنچ کر اپنے ٹھہرنے کا انتظام کرنے لگا اور سارے مرد اپنے خیمے لگا چکے تو پھر عورتیں جو امام حسین کے ساتھ تھیں ان کی باری آئی کہ وہ اپنے اپنے خیموں میں آجائیں کہ اتنے میں یہ آواز سنائی دی کہ اے لوگوں دور ہو جاؤ اس لیے کہ اپنے اپنے خیموں میں رسول زادیاں اور دیگر مستورات اتر رہی ہیں اور اتنے میں جیسے ہی جناب زینب کی سواری ان کے خیمے کے دروازے آئی تو خود اہتمام پردہ اور انتظام کے لئے امام حسین آ گئے۔اس لئے کہ حسین اپنی بہن زینب کی بے حد عزت اور قدر کرتے تھے۔امام حسین کو وہاں آتے دیکھ کر گھر کے بچوں میں علی اکبر اور حضرت قاسم جو امام حسین کے بڑے بیٹے تھے ان لوگوں نے پردے کے لیے قنات پکڑی اور جناب حضرت عباس جو امام حسین اور زینب کے چھوٹے بھائی تھے۔انتہائی بہادر اور دلیر تھے والد حضرت علی کی طرح اور اب کربلا کے میدان میں حسینی فوج کے سردار تھے وہ اپنا نیزہ تان کے خیموں کے چاروں طرف گھومنے لگے کہ دشمن کوئی حرکت نہ کرنے پائے۔

بند ۹/۲۰ :

مشکل الفاظ	معنی
عفت	پاک و پرہیزگار
خیرالنساء	نیک عورت، جناب فاطمہ زھرا کا لقب تھا
دختر	بیٹی
مشکل کشا	مشکل کو آسان کرنے والے جناب حضرت علی کا لقب ہے۔
ناقے	سواری کی اونٹنی

زیرنظر بند میں شاعر جناب زینب کی برتری اور پاکیزگی کو بیان کرتے ہوئے کہتا ہے کہ پاکیزگی اور طہارت کے جتنے مرتبے جناب فاطمہ زھرا بنت رسول زوجہ حضرت علی کو حاصل تھے وہ اپنی ماں کے بعد جناب زینب جو حضرت علی کی بیٹی تھیں ان کو حاصل تھے۔اس لیے اے کربلا کے مسافرو، ذرا دیر کے لیے خاموش ہو جاؤ جناب زینب کی سواری اتر رہی ہے اور یہی نہیں بلکہ اس کا بھی خیال رہے کہ جب تک زینب اپنے خیمے میں اتر کر نہ پہنچ جائیں اس وقت تک کوئی دوسرا ناقہ ادھر نہ آنے پائے۔جناب زینب کے مرتبہ اور شان کے اعتبار سے حسن ادب یعنی لحاظ ادب کا حسن اس درجہ کا ہو کہ خدا کو پسند ہو۔اس لیے جناب زینب کے احترام اور مرتبہ کے لیے وہ لوگ جو بلند قامت ہوں بیٹھ جائیں تا کہ بے پردگی کا کوئی امکان نہ رہے۔

بند ۱۰/۲۱ :

مشکل الفاظ	معنی
مسند پہ	بڑے گدے پر
شہ ہدا	سچا راستہ دکھانے والا بادشاہ
حرم سرا	جہاں عورتیں قیام کریں
مہ لقا	خوبصورت، چاند

نذریں	تحفے جو اپنے سے بڑے لوگوں کو دیں
اِستادہ	کھڑا ہونا
فرطِ خُلق	اخلاق کے سبب
شبیر	جناب امام حسین کا نام ہے
بغل گیر	گلے ملنا

اور اب آگے تینوں بند ایک طرح سے بین کے ہیں جو آسان ہیں اور امتحان کے نقطۂ نظر سے غیر اہم ہیں۔

❑❑❑